ماہنامہ

الحق

اکوڑہ خٹک

پاکستان کے پچاس سال مکمل ہونے کی مناسبت سے

خصوصی شمارہ

ایک تاریخی دستاویز — ناقابل تردید حقائق کا مرقع

۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۷ء

- مقصدِ تخلیقِ پاکستان سے مسلسل انحراف
- پچاس سالہ روداد سفر
- کیا کھویا کیا پایا
- تحریکِ آزادی و تحریکِ پاکستان میں علماء کا روشن کردار
- کیا ملک میں مغربی جمہوریت کا تجربہ کامیاب رہا
- مسلسل ناکامیوں کی داستانِ الم
- ملک تو بن گیا مگر قوم --------

ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ اگست ۱۹۹۷ء

اے لوگو! جو ایمان لائے ھو
آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے
نہ کھاؤ ، لین دین ہونا چاہیئے آپس کی رضامندی سے، اور
اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔
(النساء = ۲۹)
استحکام پاکستان کے لئے دعاگو
میاں حاجی کرم الٰہی اینڈ سنز تاجران چائے
چوک یادگار پشاور شہر

اے بی سی آڈٹ بیورو سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

جلد نمبر ۳۲ شمارہ نمبر ۱۱ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ اگست ۱۹۹۷ء

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق قدس سرہ

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

حضرت مولانا انوار الحق صاحب مدظلہ

حافظ راشد الحق سمیع

شفیق الدین فاروق

ماہنامہ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ پاکستان فون نمبرز 0923-630435,630340

سالانہ بدل اشتراک اندرون ملک فی پرچہ ۱۵ روپیہ سالانہ ۱۵۰ روپیہ بیرون ملک ۲۰ امریکی ڈالر

پبلشر۔ مولانا سمیع الحق مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (منظور عام پریس پشاور)

اس شمارے کی قیمت 35 روپے ہے

اس شمارے کے مضامین

نقش آغاز

حافظ راشد الحق سمیع

پاکستان............پچاس سالہ روداد سفر

کیا کھویا کیا پایا؟

مقصد تخلیق پاکستان سے مسلسل انحراف

پاکستانی حکومت اور قوم اس ماہ اپنی پچاس سالہ "شاندار کارکردگی" کا جشن زرین منارہی ہے۔ مسرت اور نشاط کی رنگارنگیاں اور سامان بزم آرائی ہر جانب سجا ہوا ہے۔ڈھول باجے تھامے ہوئے ہم آئندہ نصف صدی اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ "گولڈن جوبلی" کے اس موقع پر پورے ملک میں سرکاری طور پر رقص و سرور اور دیگر لہو لعب کی تیاریاں بھی عروج پر ہیں لوگوں نے مختلف سطح پر اپنے اپنے ذوق کے مطابق اور اپنے مقاصد کے تحت مختلف پروگرام ترتیب دے رکھے ہیں۔ان کی اکثریت تو ان "جی حضوریوں" کی ہے جو حکمرانان وقت کے ہر قول و فعل پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے کے عادی ہیں۔ زمانہ حال کے ابو الفضل اور فیضی کا کردار ادا کرنے والے یہ نام نہاد دانشور، صحافی اور بہی خواہان ملک وملت اس نازک وقت اور ابتر حالات میں بھی حقائق سے چشم پوشی اور صرف نظر کرنے کا وطیرہ اختیار کیئے ہوئے ہیں اور سیاہ کو سفید کہلانے پر تلے ہوئے ہیں۔

"اس پر مسرت" موقع پر ہم بھی اس "جشن بہاراں" میں ایک نوحۂ غم اور داستان الم سنانے کے لئے اس بزم عیش ونشاط میں "شمولیت" کررہے ہیں اگر چہ اس گستاخانہ جسارت پر اور ان(نواہائے پریشاں) اوراظہار کلمۂ حق سے قصر صدارت اور ایوان ہائے حکومت کی رنگینیوں میں بد مزگی اور خلل اندازی واقع تو ہوگی اسلئے کہ

در مجلس خود راہ مدہ ہم چوں منے را   افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

لیکن آج مادر وطن اور ملک و ملت کو "گولڈن جوبلی" اور دیگر خرافات کی بجائے اس جاں بلب مریض(ملک وقوم) کو فوری نگہداشت اور دوا دارو کی ضرورت ہے۔ تو ہم ایسے موقع پر ان نا عاقبت اندیش حکمرانوں اورارباب بست و کشاد کے اس "صنم کدے" میں اذان حق بلند کرنا ضروری سمجھتے ہیں

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں   مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اور ساتھ ہی مسلم لیگی قیادت (موجودہ حکمرانوں) کو " جو کہ تخلیق پاکستان کی دعوے دار جماعت بھی ہے " انکی پچاس سالہ ناکامیوں بداعمالیوں اور بے وفائیوں کی ایک جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آج جبکہ پوری قوم گولڈن جوبلی کے پر فریب نعرے کے نشہ میں مخمور اور محو رقص ہے چاہئیے تو یہ تھا کہ اس موقع پر حکمران اور قوم اپنا محاسبہ کرتی کہ اس پچاس سالہ سفر میں ہم نے ترقی و تعمیر کی کتنی منازل طے کیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئےاور اس طویل سفر میں ہم نے کیا پایا ،کیا کھویا ۔۔۔۔؟ آج بجائے محاسبے اور گرفت کے ہم دور جاہلیت کی فرسودہ اور لا یعنی(یادگار مشئوم) جشنوں میں گم ہوگئے حالانکہ مصائب کے بھنور میں پھنسی ہوئی قوم کے لئے یہ خرافات و تفاخرات چہ معنی دارد۔۔۔۔ ہماری اس تغافل کیشی، زبوں حالی اور نادانی پر اہل دل خون کے آنسو نہ روئیں تو کیا کریں۔ ع کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتارہا۔

آج پچاس سال بعد وطن عزیز کے" کھنڈرات" پر مسلم لیگ نے نئے وعدوں اور" بھاری مینڈیٹ" کے طوفانی گھن گرج کے ساتھ اپنا تخت طاؤس سجایا ہوا ہے اور انہی کے ہاتھوں زمام اقتدار ایک بار پھرایسے نازک موقع پر تھما دی گئی ہے ۔پچاس سال تو انہی کے مہربانی اور لطف وکرم سے آج ہم اس حال کو پہنچے ہیں خدا جانے آئندہ پچاس برسوں میں ملک و قوم کو یہ لوگ کہاں پہنچادیں گے ؟ ۔ہمیں اپنی قوم کی نادانیوں اور خود فریبیوں پر ماتم کرناچاہیئے، جو پچاس سالہ سفر میں قدم بقدم رہنماؤں کے ہاتھوں لٹتی اور گمراہ ہوتی چلی آرہی ہے ۔ سہانے باغات اور خوشنما وعدوں کے محلات کے خواب دکھاکر ساری عمر کے لئے قوم کو ویرانوں اور صحراؤں میں بھٹکنے کے لئے پھینک دیا گیا۔ دو قومی نظریہ کوطاق نسیاں کی نذر کردیاگیا۔ قیام پاکستان کے فورا بعداسلامی دستور سازی، ترقی و تعمیر اور قوم سازی کے عمل کو چھوڑکر ساری توانائیاں کرسئ اقتدار اور طاقت کے حصول کے تگ ودو میں صرف ہوئیں ۔ اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو عملی طور پر نذر انداز کرکے ملک کو سیکولراسٹیٹ بنا دیا گیا۔ اور یہ لوگ جلد ہی اپنے وعدوں سے مکر گئے ، شہداء کے خون سے غداری کی گئی پھر انہوں نے قائد اعظم کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا ؟اور تحریک آزادی کے رہنماؤں کو بھلا کر ملک کے اوپر ایک مخصوص طبقہ مسلط کردیا گیا۔ کیا یہ وطن دولتانوں نیازیوں ،چوہدریوں، لغاریوں ، مزاریوں ، زرداریوں،گیلانیوں ، ٹوانوں، بھٹوؤں ،جتوئیوں ، نوابوں ، وڈیروں ، جاموں ، خانوں ،ہوتیوں،"شریفوں" اور فوجی آمروں کے لئے بنا یا گیا تھا ۔۔۔۔ ۔ جوقوم اپنی زندگی کے قیمتی ترین پچاس برس ضائع ہوجانے پر بھی ہوش میں نہ آئے ، تو ایسی غلفت شعار قوم اور مفاد پرست حکمرانوں سے مستقبل میں ہمارا ملک پاکستان کیا توقع رکھے گا ؟بعض "یار لوگ" اب بھی اس

بقیہ بیک ٹائیٹل (آخری صفحہ) پر ملاحظہ فرمائیں

خوش فہمی میں مبتلاء ہیں کہ(ان حالات میں) اسی قوم کی کوکھ سے جلد انقلاب جنم لے گا۔ تو یہ امر محال، خیال خام بلکہ جنون ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی قوم اپنی شناخت کھوتی چلی جارہی ہے۔ اور منزل سے بھی دور..... بلکہ نشان منزل بھی مٹنے کے قریب ہے۔ سچ پوچھئیے تو ہم پچاس برس پہلے اگر برطانوی استعمار کے غلام تھے تو آج نصف صدی کے بعد امریکی غلامی کے طوق گراں سے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں اگر حقیقی معنوں میں ہم آزاد، خودمختار، وخوددار قوم ہوتے تو یہ بے نام ونسل امریکی ہمیں گندی گالیاں دینے کی جرات کیوں کرتے۔ ہم کیا ہیں اور ہماری قوم کیا ہے؟۔ ایک ہجوم پریشاں...... بلکہ" بہائم کا" ایک بدکا ہوا" ریوڑ" جسے ہر کوئی اپنی اپنی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کررہا ہے۔ کبھی مارشل لاء کے ڈنڈے کے ذریعے سے اور کبھی اسلام کے عصا سے، اور کبھی جمہوریت کی چھڑی سے۔ ہمارے حکمرانوں کو اسلام، مذہب، دستور، دین وشریعت، دو قومی نظریے اور آزادی کے متوالوں کے جذبات کی کوئی پرواہ نہیں۔ انہوں نے دلفریب وعدوں کے علاوہ اس عرصہ دراز میں کیا کیا؟ خیر اس کو تو جانے دیجئے۔ کیونکہ یہ تو حصول آزادی اور قوم کو بھڑکانے کیلئے وقتی، جوشیلے اور خوشنما نعرے تھے۔ مقصد حاصل ہوجانے کے بعد حکمرانوں کی نظر میں ان کی حقیقت اور حیثیت کیا رہ گئی تھی؟

ع کیسی آنکھیں پھیرلیں مطلب نکل جانے کے بعد

اس لئے کہ حکمرانوں کے بقول ہم مولوی کا" اسلام" یہاں پر نافذ نہیں کرسکتے۔ چلئے مولوی کا اسلام تو "فرسودہ"،" جامد" اور آج کل کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ لیکن ان پچاس برسوں کے بعد کم سے کم ہمیں یہ سوال کرنے کا حق تو دیجئے کہ کچھ پوچھنے کی جسارت کرسکیں۔ آپ کی مغرب سے "برآمد کردہ جمہوریت" نے ان پچاس برسوں میں ملک وقوم کو کیا دیا؟ اور ہمیں کتنے عزتوں کے تاج پہنائے۔ قوم کو عظمتوں کی کتنی خلعتیں عطاء کیں۔ اقوام عالم میں ہمارا وقار کتنا بلند ہوا۔ جمہوری اقدار اور جمہور (عوام) پارلیمنٹ، آئین ودستور، قانون، عدل وانصاف کی کلاہ فاخرہ کتنی اونچی کی گئی؟ اقتصادی ترقی کے کس معراج پر پہنچے اور اخلاقی بلندی کے کس اوج ثریا کو چھوا؟ اس کے بعد ہم فوجی طالع آزماؤں اور عسکری سورماؤں کی طرف روئے سخن پھیرتے ہیں کہ ان کے پچیس سالہ مارشل لاؤں نے ملک وقوم کی کتنی خدمت کی۔ اور کتنے بحرانوں کے گرداب سے قوم کی کشتی کو نکال کر ساحل مراد تک پہنچایا۔ اور میدان کارزار یا حربی معرکوں میں ہمارے ملک کو کتنے تمغے اور ستارے مہیا کیے؟ اسی طرح دیگر" مقتدر" قوتوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ نے تعلیم وآگہی، سائنس، ٹیکنالوجی، معاشیات، اقتصادیات، مواصلات، میڈیا اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیں

؟ ان سب کا جواب کیا کسی کے پاس ہے ؟ بولیں ....آج آپ کی زبانوں پر کیوں مہر ندامت لگی ہوئی ہے لیلائے جمہوریت کی خاطر دین ودنیا اور دل ہر چیز کو تم گنوا بیٹھے ہو۔ اور نتیجہ یہ کہ

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

(خسر الدنیا والآخرہ ذالک ھوالخسران المبین) نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ملک وقوم دونوں کی حالت ناگفتہ بہ بلکہ بد حال سے بدحال تر ہوئی ہے۔ اور اگر یہی بہی خواہان ملک وملت (مسلم لیگ، پیپلز پارٹی وغیرہ) مستقبل میں بھی مسند اقتدار پر یونہی" جلوہ افروز" ہوتے رہے تو خدانخواستہ آئندہ سو برس کے موقع پر (خاکم بدھن) شاید لوگ ملک وملت کے" مزاروں " اور " کھنڈرات " پر " ڈائمنڈ جوبلی " کے چراغ روشن کرنے جمع ہوں (ولا فعلھا اللہ)۔ اور اقوام عالم میں ہم ایک داستان پارینہ بن چکے ہوں۔

ع　تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں　　اور

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اگر اس فتنہ یاجوج وماجوج کے سامنے قوم نے سد سکندری نہ باندھا تو پھر انجام کار

ع　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

آج پوری قوم " گولڈن جوبلی " کے موقع پر صحرائے ناامیدی، تیھہ پریشانی، دشت مایوسی اور بیابان حیرانی میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ اور وہ مسیحا، وہ رہنما، وہ خضرراہ اور وہ ناخدا نظر نہیں آتا، جس کے امید و انتظار میں ملک وملت کی آنکھیں پتھرا گئیں ہیں۔ ع　قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

کیونکہ جو رہنمایان وطن تھے وہی راہزن نکلے اور جن پتوں پہ تکیہ تھا وہی آشیاں سوزی کے لئے ہوا دینے لگے۔ آج کہاں جائیں؟ ملک کے تمام طبقات خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، عوام ہوں یا خواص، یا پھر امیر کارواں ہو، یا اہل قافلہ سب مایوسی اور قنوطیت کے گرداب میں پھنسے نظر آتے ہیں۔ اور مخمصے کی یہ کیفیت قوم پر کیوں طاری نہ ہو، کیونکہ انہوں نے آزادی کے وقت جو وعدے سنے تھے اور جو" ناخدایان قوم" دیکھے تھے (اور آج بھی دیکھ رہے ہیں) ۔انہوں نے اپنے عہد سے صریح انحراف کیااور کر رہے ہیں اور یوں اعتماد واعتقاد اور انقیاد کے مقدس آبگینے سنگ محرومی سے ٹکراکر ورچور ہوگئے اور آج نتیجہ یہ ہے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے

کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان پچاس برسوں میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

اگر رزلٹ اور نتیجہ مثبت ہو تو پھر تو خوشی منانے کی تک بن سکتی ہے ،لیکن اگر ملک کے وجود کا نصف دھڑ ہندو بنئے اور کانگریسی گماشتوں کے شاطرانہ چالوں کے باعث کٹ چکا ہے ۔اور بقول قائد اعظم

بقیہ صفحہ نمبر ۲۰۶

جناب حکیم محمد سعید صاحب
چیئرمین ہمدرد فاؤنڈیشن (کراچی)

نعمت آزادی کی بے قدری

مزاج ملت پوری حقانیت کے ساتھ تہذیب وتمدن کا عنوان اور روایت وثقافت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ مسلمان کی حیات مستعار کا ہر لمحہ قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں بسر ہونا چاہیئے۔ اور اس کی ہر آن کو اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عبارت ہونا چاہیے۔ یہی وہ فکر ملت ہے جو اقوام وملل عالم میں مسلمان کو امتیاز دیتا ہے۔ اور اس کے وجود و شخصیت کو مشخص و مستحضر کرتا ہے۔ اگر پاکستان کے پچاس سال اس اتباع ومماثلت میں گزرتے تو ملت اسلامیہ پاکستانیہ سرفراز بھی ہوتی اور صف اقوام عالم مین اسے سربلندی بھی حاصل ہوتی۔

ملت اسلامیہ پاکستان کے ساتھ سب سے بڑا حادثہ یہ گزرا ہے کہ اس نے "واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً ولاتفرقوا" کو فراموش کردیا اور فراموشی کا یہ سلسلہ پچاس سال کو حاوی ہوا ہے۔ کسی بھی شعبہ زندگی پر غور کرلیجئے، اختلاف امہ موجود ہے۔ صحافت ہو کہ سیاست، امامت ہو کہ قیادت سب کے سب افتراق کے شکار ہیں اور انتشار کا ایک دل سوز نمونہ انتشار وافتراق صحافت نے ذہن ملت کو پارہ پارہ کردیا ہے۔ اور ملت کی منزل مقصود تک رسائی نہیں ہونے دی ہے۔ سیاست نے لباس کذب پسند کیا اور فروختگی فکر وقلم تک نوبت پہنچی۔ امامت فرقہ ہائے کثیرہ میں تقسیم ہوئی اور اس افتراق وانتشار امامت نے قلوب مسلم سے محبت واحترام اسلام کو خارج کردیا ہے۔ قیادت پاکستان اپنی ذات کا عنوان مکروہ بنی رہی ہے، اور اسے پاکستان کو دیکھنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔ نفی ذات پر اسے کبھی قدرت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ پاکستان تفسیر سورۃ رحمان، ہر نعمت خداوندی سے مالامال، ذرائع وذخائر سے مملو، قرآن حکیم اس کا دستور حیات، اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی اساس وبنیاد، بہ ایں اس ملت کی بدبختی کہ ہر نعمت کا کفران اس کی قسمت کیا حریت اور آزادی سے بڑھ کر کوئی بھی نعمت ہوسکتی ہے؟ اسی حریت اور آزادی کو اس ملت نے نیلام پر چڑھادیا ہے۔ فقر پر فخر نہ کرکے اس ملت نے راہ عیش وعشرت کو پسند کرلیا۔ مساوات کو فراموش کرکے انسانیت وشرافت کو ہدف کوفت بنادیا ہے۔

زراعت سے غفلت برت کر اور خوشہ گندم کی بھیک مانگ کر اپنی زندگی کو بے آبرو کرلیا ہے۔ صنعت کو تابع مہمل کرکے اس نے بے ہوشی اور بے لبسی کا تاج پہن لیا ہے۔ دست نگری اس کا شیوہ بنی ہے۔ قرض اس کا موضوع حیات۔ بھیک اس کی قسمت، کاسہ گدائی اس کا زیور۔ ذات کی پرستش اس کی جبلت۔ اب اس کے سامنے روشنی اسلام کہاں ہے؟ یہ ملت اب تاریکیوں میں بھٹک رہی۔ کروڑوں روپے روزانہ سود ادا کررہی ہے اور پھر بھی کاسہ گدائی اسکے ہاتھوں میں ہے۔ در در بھٹک رہی ہے۔ بھیک مانگ رہی ہے، دھتکاری جارہی ہے۔ بے شرم ہورہی ہے، بے عزت ہوتی چلی جارہی ہے، سیاست وقیادت نابینا تماشا دیکھ رہی ہے۔ اس ملت کو یہ نظر نہیں آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کن کن نعمتوں سے نوازا ہے۔ ۲۷ رمضان المبارک کو شب قدر کی مقدس ساعتوں میں سب سے بڑی نعمت آزادی اسے عطافرمائی۔ اس آزادی کی قدر کرنے کا مشورہ دیا۔

قدرت نہ حاصل ہونے کی بنا پر قیادت پاکستان مکروہات کا عنوان بنی ہے، اور اس کے فکرو کردار نے ذہن وفکر ملت کو آوارگی سے عبارت کردیا ہے۔ کہنا چاہئیے کہ پچاس سال میں ایک ایک کرکے ہر ہر ستون منہدم ہوگیا ہے اور وقیع وپرشکوہ عمارت پاکستان مٹی کا ڈھیر بن گئی ہے۔ اس مٹی کے ایک پلید ڈھیر کو نہ مقاصد پاکستان کا ہوش رہا ہے اور نہ فرائض پاکستان کا کوئی احساس باقی رہا نہ ادراک۔ آزادی کی ہر برکت سے ملت اسلامیہ پاکستان محروم ہوئی ہے، حتیٰ کہ ہر فرد ملت تعلیم سے محروم اور بے بہرہ اور تربیت سے ناآشنا رہا۔ پچاس سال آنکھ جھپکتے گزر گئے اور جہالت کی تاریکیوں نے پاکستان کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ اس ملت میں اب نہ علم کا چرچا ہے اور نہ حکمت کی آرزو وتمنا۔ ملت پاکستانیہ نے اسے فراموش کردیا ہے کہ ہادی برحق جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا عنوان جلی تعلیم وتربیت تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدمقابل ابوجہل تھا، جہالت تھی اور ان کی تاریکیاں تھیں۔ ان تاریکیوں کو روشنیوں سے بدل دینا مقصود بعثت نبویؐ تھا۔ آج پاکستان کا شمار جاہل اقوام وملل میں ہورہا ہے اور اقوام عالم ملت پاکستانیہ کا استہزا ضروری سمجھتی ہے۔ گنہگار ہے ہر وہ قیادت پاکستان جس نے تعلیم وتربیت سے صرف نظر رکھا اور ایک عظیم ورفیع ملت کو قعر مذلت کے حوالے کردیا ہے۔ تعلیم وتربیت سے محروم ملت پاکستانیہ مرتبہ انسانیت کو فراموش کرچکی ہے۔ اسے نہ آزادی سے محبت ہے اور نہ ہی حریت سے الفت۔ ہر ہر میدان میں وہ غلامیاں قبول کرتی چلی جارہی ہے اور آزادیاں فروخت کرتی چلی جارہی ہے۔ قدرت نے سرزمین پاکستان کو ظاہر وباطن نعمتوں سے مالا مال کردیا مگر کفران نعمت یہ کہ اس ملت نے وطن کی حفاظت نہیں کی۔ محنت اور محبت سے منہ موڑا اور کاہلی کو

خوش آمدید کہا اور نفرت کو اپنے آغوش میں بٹھایا اور ہر نعمت سے محرومی کا خود سامان کیا۔

اس ملت کے برعکس طاغوت کی ہر طاقت جواں اور جواں تر ہوکر حملہ آور ہے۔ اس نے پاکستان میں علم اور عالم پر حملہ کرکے اسے خاموش کردیا ہے۔ پاکستان کی درس گاہوں میں انگلش میڈیم کا اجراء ہوا۔ زور وشور ہوا۔ اپنی زبان سے نفرت ہوئی، اپنے کردار سے فرار ہوا اور افکار غیر درس گاہوں میں پھلے پھولے، نونہال او نوجوان ملت خود ناشناس بنا اور خدا ناشناسی اس کا مزاج بنی اور پھر عالم ناشناسی نے اسے اپنی گرفت میں لے کر اسے بے گانہ عالم کردیا ہے۔ یہ ملت اسلامیہ نعروں پر اتر آئی ہے۔ جشن زریں اس طرح منارہی ہے کہ آدھا پاکستان رہ گیا۔ اب جشن زریں اس کا ہے کہ آدھا پاکستان طاغوت کی زد میں ہے۔ طاغوت نے ان اسلام اسلام نعروں کو ہوائیں دے رہا ہے اور مسلم کو عمل سے عاری و محروم کرتا چلا جارہا ہے۔ عزت نفس غارت ہوتی چلی جارہی ہے اور خودی پامال ہوتی چلی جارہی ہے، خودداریاں زیرپا مسلی جارہی ہیں۔ ماضی سے غافل، حال سے لاپرواہ اور مستقبل سے بے ہوش یہ ملت اور اس کا ہر ہر فرد ڈانواڈول ہے۔ یہ زندگی نہیں ہے شرمندگی ہے۔

ہوشیار باش اے فرد وطن! ایسا نہ ہوکہ یہ کاذب سیاست، یہ فاسد قیادت، یہ منتشر ومتفرق امامت اور یہ رنگین اور فحش نگار صحافت تم کو مذلت کے حوالے کردے۔ ہوشیار باش اے اہل فرد! ایسا نہ ہو کہ پاکستان فروخت ہوجائے اور تم کل شدید غلامی میں جکڑے جاؤ۔ اے اہل پاکستان! تم مسلمان ہو، غلامی مسلمان کا عنوان ہرگز نہیں بن سکتی۔ تمھارے پاس تو قرآن حکیم ہے۔ اس سے روشنی حاصل کرو۔ تمھارے پاس تو سنت رسول مقبولؐ ہے۔ اس کا اتباع کرو۔ تمھارے پاس خودی وخودداری ہے۔ اپنی آزادی کی حفاظت کرو۔ تمھارے پاس جذبہ فراواں ہے اس کا پاس کرو اور لحاظ۔ کردو انداز اس کاذب سیاست کو۔ کردو نظر انداز اس فاسد قیادت کو، کردو نظرانداز اس متفرق امامت کو۔ نظرانداز کردو نظر انداز اس بے ضمیر صحافت کو۔ اپنی خودی کو بیدار کرو۔ اپنی خودداری کو برسرعمل کرلو۔ وقت آگیا ہے کہ ایک انقلاب برپا کردو۔ عیش وعشرت کومٹادو۔ کاسہ گدائی کو توڑ ڈالو۔ تمھاری عزت نفس مطالبہ کرتی ہے کہ تم غربت اختیار کرلو، غور کرو کہ تمھارے ہادی برحق جناب حضرت محمدؐ نے غربت اختیار کی تھی۔ فقر پر فخر کیا تھا۔ اپنے عمل سے تم کو بتایا تھا کہ دولت سے محبت نہ کرنا کہ دولت قاطع محبت ہے۔ دولت انسان کو ذلیل کرتی ہے۔ اگر اسے اپنی ذات پر خرچ کیا جائے۔ دوستو! اپنی زندگی میں انقلاب برپا کرو اور پھر اخلاق وکردار کی طاقت سے پاکستان میں انقلاب برپا کردو۔ اسلامی شوریٰ قائم کرو پھر ساری اقوام عالم کے سامنے سرخروئی کے ساتھ آگے بڑھو اور بڑھتے چلے جاؤ۔

فراموش نہ کرو کہ پاکستان عظیم ہے۔ پاکستان تفسیر سورۃ رحمان ہے۔ ہر ہر نعمت سے مالامال ہے۔ تفکر کرو۔ تدبر سے کام لو۔ محنت کرو، محبت کرو، تم معمار حرم ہو۔ تعمیر جہاں کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری حامی وناصر ہو۔

جناب صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی صاحب
ایڈیٹر ماہنامہ "تسخیر" لاہور

ملک تو بن گیا، قوم نہ بن سکی

ان دنوں وطن عزیز کی پچاسویں سالگرہ منانے کی تیاریاں زوروں پر ہیں، آئے روز اجلاس ہورہے ہیں، کمیٹیاں تشکیل دی جارہی ہیں، ریڈیو اور ٹی وی اپنی نشریات میں اس جشن مسرت کو نمایاں کررہے ہیں، اور حکومت اپنے طور پر انتظامات میں لگی ہوئی ہے بلکہ "گولڈن جوبلی ٹرین" بھی تیار ہورہی ہے جو کراچی سے لنڈی کوتل تک چلائی جائے گی۔ جس پر کروڑ روپے سے اوپر اخراجات اٹھیں گے، ۱۴ اگست ۱۹۹۷ء کو ملک اپنی پچاسویں سالگرہ منائے گا، سرخوشی کی اس محفل میں زخم دل کی بات کرنا ایک گونہ حماقت ہی سہی لیکن ہے بہرحال تلخ حقیقت کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی گہری شام تک سات برس کی جدوجہد کے نتیجے میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو ایک ملک تو وجود میں آگیا مگر بدقسمتی سے بعد کے پچاس سالوں میں ابنائے وطن ایک ــــ قوم ــــ نہ بن سکے، حالانکہ تحریک پاکستان اٹھائی ہی ــــ دو قومی نظریے ــــ پر گئی تھی اور قائداعظمؒ نے اپنے پورے علم وایقان کے ساتھ دو قومی نظریے کی وکالت کی تھی اور بلاشبہ کامیاب وکالت، دوقومی نظریہ کیا ہے؟ ایک علیحدہ قوم، ایک باقاعدہ قوم اور ایک ثابت شدہ قوم کا علمی و عملی نظریہ! قائداعظمؒ نے ایک سے زائد بار کہا کہ ہم ہر دلیل اور معیار کی رو سے ایک جداگانہ قوم ہیں، یعنی قوم رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری ساخت کو اقوام مغرب پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے، ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے تنگ دائروں اور رنگ ونسل کی تاریک غاروں کے باسی نہیں بلکہ ــ ملت بیضاء ــ ہیں، جس کے دن رات یکساں روشن ہیں، اسی بنیاد پر ایک الگ وطن کی ضرورت محسوس ہوئی، آخر الامر وطن تو مل گیا لیکن قوم کہیں درمیان میں گم ہوگئی، قائدؒ کی زندگی میں بنگالی زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور بنگلہ دیش بن کر رہا، سندھ میں بھی لسانی بل نے مہاجروں اور مقامیوں میں ایک دیوار کھڑی کردی، وقت نے دیوار برلن گرادی مگر مہاجر اور مقامی کے درمیان دیوار روز بہ روز اوپر اٹھ رہی ہے گرنے کا نام نہیں لے رہی، دوسری طرف بلوچستان میں ایک سے زائد بار ــ عظیم تر بلوچستان ــ کی باتیں ہنئی

گئیں۔ کئی بلوچ رہنما بلوچستان کو ایک حقیقت اور پاکستان کو کل کی پیداوار کہتے ہوئے پائے گئے۔ کالاباغ ڈیم ایک قومی ضرورت اور نیشنل ایشو نہیں بلکہ سیاسی اور علاقائی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ پورا ملک بنجر ہوتا ہے تو ہوتا رہے کسی کا سیاسی کھیت نہ سوکھنے پائے، یہ ساری علامات قوم نہ ہونے کی ہیں۔ ملت یا قوم ایک وسیع المشرب، وسیع الظرف اور وسیع الذہن ادارے کا نام ہے، اس کے ہاں تنگ دلی، تنگ ظرفی اور پست خیالی کا گزر نہیں ہوتا۔

قوم رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں تو براعظموں کے فاصلے کوئی معنیٰ نہیں رکھتے۔ کجا کہ صوبے سے آگے نظر نہ جاسکے، مدینے کی چند ہزار نفوس اور ساڑھے چار کلومیٹر پر مشتمل ابتدائی ریاست میں اتنی ذہنی بلندی اور روحانی وسعت تھی کہ حجاز، نجد، فارس، روم، بازنطین، حبش کے باشندے اور قریش، بنو ہاشم، اوس، خزرج، بنو تمیم، بنو کلب اور انصار و مہاجرین کے نمائندے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کھجور کے تنے اور چھال کی چھت تلے مؤاخات کا روح پرور مظاہرہ کررہے تھے۔ جب کہ چودہ کروڑ افراد اور تین لاکھ سات ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے پاکستان کا دامن اس قدر سمٹا اور سکڑا ہوا ہے کہ چار صوبے اور چار فقہی مسالک مؤاخات نہ سہی محض برداشت کے جذبے کے تحت ہی ایک ساتھ گزارا نہیں کرپارہے۔ جس طرح مکان سنگ و خشت کا مجموعہ ہوتا ہے اس کا اصل شرف اس کے مکین سے ہوتا ہے اسی طرح ملک ایک مخصوص حدود اربعہ، رقبے اور طے شدہ سرحد کا نام ہوتا ہے۔ اس کی شناخت، عزت اور بین الاقوامی برادری میں حیثیت اس میں بسنے والی قوم کے ذریعے متعین ہوتی ہے، اگر وہ قوم ایک ہجوم میں بدل کر رہ جائے تو اس ملک کا شکوہ اور دبدبہ مجروح ہوجاتا ہے۔

گذشتہ پچاس سالوں میں ہم نے نئے سے نئے محکمے تصنیف کر ڈالے، بڑے بڑے پلازے کھڑے کردیئے، طرہ طراز اور گردن فراز لیڈر پیدا کرلئے، ایک سے بڑھ کر خوش فریب نعرے گھڑ لئے، سرزمین وطن کو جنت ارضی بنا دینے کے منشور لکھ لئے، بول چال، بود وباش اور زبان وبیان میں انگریز بننے کے گر سیکھ لئے، اور لوگوں کی سادگی وسادہ لوحی کا استحصال کرنے کے نت نئے ڈھنگ اپنالئے۔ مگر اس عرصے میں اپنے پیروں کاروں کے اندر ــــ ملت اور قوم ــــ بننے کا جذبہ نہ ابھار سکے۔ آج لنڈی کوتل سے کراچی تک کا سفر کرکے دیکھ لیجیئے آپ کو فاٹا کے ملک، یوسف زئی، ترین، عباسی، جاٹ، گجر، کانجو، گردیزی، میرانی، جتوئی، دریشک، مزاری، جھنگل، بگتی، مگسی اور بجرانی تو ملیں گے پاکستانی نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہوں گے، یہی حال مذہبی دنیا کا ہے، حالانکہ

مذہبی دنیا کے ذمے سب سے اہم فریضہ ملت کے تصور کو اجاگر کرنا تھا تاکہ ہر رنگ پر الہیٰ رنگ اور ہر جمعیت پر امت غالب آجائے۔

آج جو ہر کونے سے فتنے حشرات الارض کی طرح یلغار کرتے ہوئے نکلتے چلے آرہے ہیں، دو چار دن کا المیہ نہیں نصف صدی کا نتیجہ ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

آج اگر ملک سونے کی کان میں بدل جائے تو پھر بھی ہوس اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس سے چند لوگوں کا پیٹ بھرے گا باقی لوگ بھوکے ہی رہیں گے، آج اگر ملک اسلحے میں خود کفیل ہوجائے تو یہ اسلحہ اپنوں کی چھاتیاں داغنے کے کام آئے گا، آج اگر وسائل کا سمندر ابل پڑے تو ہر صوبہ اور ہر طبقہ خود ہی تڑپ کرنے کو آگے بڑھے گا اور آج اگر گلشن وطن میں بہار اتر پڑے گا تو ہر ایک دوسرے کیلئے خزاں کی آرزو کرے گا جہاں ملت نہیں ہوگی وہاں جمعیت کہاں سے آئے گی؟ اور جہاں جمعیت نہ ہو وہاں قدرت کا دست رحمت کیسے ظاہر ہوگا؟

★★★★★★★★★★

جناب قاضی عبدالکریم صاحب
مہتمم " نجم المدارس " کلاچی

ہم پاکستانی مسلمانوں کے پچاس سالہ " کارنامے "

دنیوی لحاظ سے :-

(۱). ملک کا ایک اہم بازو ہم سے کٹ گیا۔ نوے (۹۰) ہزار غیور جری اور ایماندار فوج کو ہماری لیاقت اور دیانت کی وجہ سے کفار کی قید میں جانا پڑا۔ (۲). کرپشن کے مریض ہمارے معزز ممبران اسمبلیوں کو افسوس ہے کہ ہم بددیانتی میں پہلا نمبر حاصل نہیں کر سکے۔
(۳). پورا ملک خاک و خون میں تڑپ رہا ہے۔ کراچی کو فوج کے حوالہ کرنے پر باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ کہیں یہ تاریخ ڈھاکہ کو دہرانے کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو۔ (۴). ٹی۔وی ،وی سی آر اور ویڈیو کے ذریعہ ملک کا گھر گھر قحبہ خانہ میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ (۵). ہندو کی جارحانہ حملوں، خطرناک تعصبات اور کشمیر جنت نظیر وادی خون میں تبدیل کردینے اور ہزاروں نے بڑھ کر مسلمان عورتوں کی عزت و ناموس فوجی درندوں کے ہاتھوں برباد کرانے کے باوجود ان سے تجارتی معاملات پر خوشی کا اظہار کرنا۔ (۶). آج ملک کنگال ہے اس کا بچہ بچہ ہزاروں کا قرض دار ہے، گویا ہمارا ملک نہ " زرعی " ہے نہ یہاں کوئی " زرخیز " اور لائق زمین ہے، نہ یہاں کوئی " معمولی " سی نہر جاری ہے اور نہ ہی کسی قسم کی قدرتی کانیں دستیاب ہیں ؟۔ (۷). گوادر قسم کی سازشوں کے تبادل طعنے بھی کانوں سے ٹکرار رہے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے دانشوروں اور بزر جمہر حکمرانوں کے "ذرین" کارنامے جو ایک دفعہ نہیں باربار صدارتوں اور وزارتوں کو " زینت " بخش رہے ہیں۔

دینی لحاظ سے :-

پاکستان نظریاتی ملک ہے اس کا واحد نظریہ اسلام ہے۔

(۱). اس کے باوجود یہاں اسلام زیردست ہے اور اسمبلیاں بالادست۔

مملکت پاک میں اک طرفہ تماشا | اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

(۲). اس اسلامی ملک کی بااختیار اسمبلیوں کا معزز ممبر بننا نہ صرف ہر فاسق فاجر بلکہ ہر بدمعاش کا پورا پورا حق ہے بلکہ اس کی بنیادی نظریہ " اسلام " کا منکر ہر غیر مسلم ہی مکمل اعزاز کے ساتھ اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ (اور بنے ہوئے ہیں)۔ علاوہ ازیں روزنامہ " خبریں " اسلام آباد ،۲ اگست

۱۹۹۴ء کے مطابق اس وقت چھ سوسولہ (۶۱۶) غیر مسلم مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو ۱۷ تا ۲۲ گریڈ کی تنخواہ لے رہے ہیں۔ جن میں عیسائی، ھندو اور قادیانی شامل ہیں۔ (۳)۔ اعداد وشمار کا محتاط اندازہ یہی لگایا جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ انگریز کے ڈیڑھ سوسالہ حکومت میں پورے ہندوستان میں اتنے مسلمان عیسائی نہیں بنے جتنے کہ صرف ان پچاس سالوں میں صرف پاکستانی مسلمان مرتد ہوکر کفر کی جھولی میں جا پہنچے جس کی وجہ خالص یہ ہے کہ اس کنگال ملک کے صدر و محترم وزراء کرام اور دیگر اہم عہدوں پر براجمان حضرات کے مشاھرات اور دیگر ضروریات جن میں ان کی ملکی اور غیر ملکی دورے اور کھلاڑیوں وغیرہ کے زرمبادلات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد شاہی خزانہ میں اتنی گنجائش بھی نہیں رہ جاتی کہ وہ ملک سے بے روزگاری کا خاتمہ کریں یا ھزاروں کی تعداد سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ حضرات کو ملازمتیں دلاسکیں۔ اب ان بے روزگاروں کیلئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ تنگدل ہوکر خودکشی کرکے جان سے ہاتھ دھوبیٹھتے ہیں اور ایمان کی قدروقیمت سے ناواقف پڑھے لکھے "فراخ دل" ایمان کا سودا کرکے روزگار حاصل کرلیتے ہیں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" تبدیلی دین کی سخت سزا تو آقایان ملک کے نزدیک انسانی حقوق کے خلاف ہے۔ رہی آزاد دینی مدارس و تبلیغ اور وعظ و نصیحت تو اولاً تو بقول مرحوم الہٰ آبادی؛

گرچہ فکر آخرت ہے اصل چیز　　　پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز

ثانیاً یہی آزاد دینی مدارس سے تو ہمارے حکمرانوں کا روزاول سے کلیجہ منہ کو آتا رہتا ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ ان پچاس سالوں میں پاکستان کی کوئی حکومت ہی ایسی گزری ہو جس نے ان آزاد دینی مدارس کو ھضم کرنے یا ختم کرنے کا منصوبہ نہ بنایا ہو۔ اور آج کل تو امریکہ پرست پاکستانیوں کو فرقہ ورارایت اور دہشت گردی کا بھوت صرف اور صرف وہیں نظر آتا ہے جہاں جہاں قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایمان افزا صدا گونج رہی ہو۔ اور اب تو سونے پہ سہاگہ طالبان افغانستان کی راسخ العقیدہ اور بنیاد پرست، سچے اسلام کی پابند حکومت نے جب سے پوری دنیا پر واضح کردیا ہے کہ امن وامان کی زندگی اور سکھ و اطمینان قلب کی نقد دولت صرف اور صرف آمنہ کے لعل صلی اللہ علیہ وسلم کی دامان رحمت میں مل سکتی ہے تو اب تو دنیائے کفر اور ان کے متوالے طالبان اسلام کا نام سنتے ہی ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ سیلاب کیسے رکے؟۔ یہ ہے ہماری پچاس سالہ زندگی کا تمام نقشہ اب اپنی اس ناکام ترین زندگی پر اگر ہم خوشی کے ترانے بجانے لگیں تو دنیا کے ذی ہوش ہمیں دیکھ کر یہی کہینگے کہ

حیا وشرم وندامت اگر کہیں بکتے　　　تو ہم یہی لیتے کسی اپنے مہربان کیلئے

روز مسرت یا یوم ندامت :-

حقیقت یہ ہے کہ یہ دن ہمارے لئے بجائے یوم مسرت کے یوم ندامت ہے اور ہمارا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ ہم سے اس طویل عرصہ تک اس عظیم نعمت آزادی بصورت عطیہ پاکستان کی جو بیقدری ہوئی اس پر رورو کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں ۔ جو لوگ صرف حرص دنیا کے قائل ہیں اور ان کا نظریہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کا ہے ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے ۔ آخرت پر یقین رکھنے والے علماء کرام، مشائخ عظام اور دینی مراکز کے دینی جرائد ۔ اگر صدق دل سے واضح اسلام کے ان تین بنیادی باتوں کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں کہ

(الف)۔ اس ملک کی اسمبلیوں سے بالادستی چھین کر قرآن وسنت اور اجماع امت کی جھولی میں ڈال دینا ہے ۔ (ب). پاک اسمبلیوں کو غیر مسلموں اور بدمعاشوں سے پاک کرانا ہے ۔

(ج). اور انتخابات ارباب حل وعقد کے ذریعہ منظور کرنا ہے ۔ تو انشاء اللہ دین اسلام کی عظمت رفتہ کی واپسی اور ملک کے امن واستحکام کا منظر قابل دید ہوگا ۔" واللہ علی ماتقول وکیل ۔"

★ ★ ★ ★ ★ ★ ★ ★

ملت کی ترقی کا راز

قرآن حکیم نے ملت کی بقا و استحکام اور مسلمانوں کی ترقی و عروج کا راز ، اتفاق ، اور اتحاد میں رکھا ۔جب تک مسلمان ایک رہے غالب رہے ۔جب سے یہ وحدت ختم ہوئی غلبہ بھی جاتا رہا واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا پر جب تک عمل کیا جاتا رہے گا دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت مسلمانوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و مساعی اور اسلام کے تدریجی ارتقاء پر نظر ڈالیں تو ہر عنوان اسلامی تاریخ کے ہر کامیاب دور کے پس منظر میں ملی وحدت اور اہل اسلام کا اتحاد کارفرما نظر آئے گا ۔

(ارشاد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز)

جناب مولانا سمیع الحق صاحب
مہتمم دارالعلوم حقانیہ وسیکرٹری جنرل جمعیت علماء اسلام

موجودہ حالات اور اکابرین امت رح کے اندیشے

قیام پاکستان کے پچیس سال بعد ستمبر ۱۹۷۱ء کو وطن عزیز اپنوں اور غیروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث دولخت ہوگیا۔ اس دلخراش اور جگرشگاف سانحہ کے پس منظر میں مدیر اعلیٰ (الحق) جناب مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی ایک یادگار وفکرانگیز تحریر۔ (نقش آغاز جلد نمبر، مارچ ۱۹۷۲ء) آج سے کچھ عرصہ قبل ان اکابرین امت (حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ اور حضرت مولانا حسین احمدمدنیؒ وغیرھم کو اس قسم کی باتوں کی وجہ سے مطعون کیا جاتا تھا، آج پچاس برس کے بعدان حضراتؒ کےتمام اندیشے حقیقت کا روپ دھار کر انکی دوراندیشی اور فراست مومنانہ کا منہ بولتا ثبوت بن کر ہمارا منہ چڑا رہے ہیں۔ (راشد)

ایک المناک صورتحال نے ملک کا شیرازہ جس بے دردی سے بکھیر دیا ہے۔ اس پر نقد واحتساب کے ضمن میں پاکستان کے نقطہ آغاز اور تشکیل سے لیکر اب تک کے حالات پر مختلف زاویوں سے گفتگو ہورہی ہے جن خطوط اور بنیادوں پر ملک کی تقسیم یا تشکیل ہوئی، اسے بھی زیربحث لایا جارہا ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ برصغیر کی تاریخ اپنی حقیقت کی طرف سے لوٹ رہی ہے، کچھ کنفیڈریشن کی باتیں کرتے ہیں، اور کچھ لوگ دبی زبان سے سہی مگر دل کے اندر سے اٹھنے والے ان خیالات کو دبائے نہیں رہ سکے کہ پاکستان کی موجودہ مشکل میں قیام بالخصوص بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی نہایت شدومد سے مخالفت کرنے میں شاید مسلمانوں کے بعض عظیم رہنما بالخصوص شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدمدنی مرحوم کا نقطۂ نظر غلط نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اگر سیاسی اور گروہی تصورات سے الگ ہوکر حضرت شیخ الاسلامؒ کے اندیشوں پر ایک نگاہ بازگشت ڈالی جائے تو کیا حرج ہے۔ شاید ان کی نگاہ قلندرانہ کی دور رسی کا کچھ احساس تو ہوجائے خواہ اس موقف کی تصویب یا تغلیط کا کام حالات اور واقعات کے ذمہ کیوں نہ لگادیا جائے مگر حال کے آئینہ میں ماضی کے کچھ نقوش تو سامنے آہی رہے ہیں۔ پاکستان کی صورت میں خلافت اسلامیہ اور اسلامی نظام کے قیام کے مقدس اور حسین تصور میں کھوکر جن لوگوں نے اپنا سب کچھ اس راہ میں لٹا دیا ہے۔ بیشک انکی قربانیاں صدہزار تحسین اور بارگاہ ایزدی میں اجر کی مستحق ہیں کہ " انماالاعمال

بالنیات" اگر کسی کی نیتوں میں کھوٹ تھا، تو وبال اور بربادی بھی ان کے نامہ اعمال ہی میں ڈالی جائے گی، مگر اپنے وقت کے ان عظیم، خدارسیدہ اور حقیقت شناس بزرگوں کی فراست مومنانہ اور مسلسل و پیہم آلام ومصائب اور شدائد کا تحمل اس بات کی منہ بولتی شہادت رہی کہ وہ مسلمانوں کے بدخواہ نہ تھے، نہ یہ لوگ ضمیرفروش اور خودغرض نہ مسلمانوں کے دشمن، ان کی اخلاص للھیت ان کی پاکیزہ زندگی کی طرح تاریخ کے بے رحم ہاتھوں کی دسترس سے ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

ان کا ناقابل معافی جرم یہی تھی کہ وہ پاکستان میں خلافت اسلامیہ کے بلند بانگ دعوؤں کو ایک فریب اور دھوکہ سمجھ کر تقسیم ہند کو مسلمانوں کے مسائل کا صحیح حل نہیں سمجھتے تھے۔ کہ اس طرح ان کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی سفاک ہندو کے رحم وکرم پر رہ جائے گی، لاکھوں مسلمان بے گھر اور بے در ہوجائیں گے۔ جنہیں کوئی زمین ٹھکانہ نہیں دے سکے گی۔ ہندوستان میں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے ان کی حالت نہایت پسماندہ اور قابل رحم ہوجائے گی۔ اسلام پورے برصغیر سے ایک گوشہ میں سمٹ کر رہ جائے گا، جبکہ ان کے خیال میں ان کے پیش کردہ فارمولا سے پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ جانے کی بجائے پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا، جس میں شرعی احکام کا نفاذ مسلمانوں کے کامل اور آزاد اختیارات کے ذریعہ پورے ہندوستان میں ہوسکتا۔ (اجلاس جمعیت العلماء لاہور ۱۹۴۶ء کی قرارداد) پاکستان کی مجوزہ سکیم پر ان بزرگوں نے نہایت خلوص سے ہر پہلو پر غور کیا اور اس کے سیاسی، اقتصادی، لسانی، ملکی، تبلیغی، خارجہ پالیسی، غرض ہر گوشے پر اپنے تنقیدی خیالات پیش کئے، اور اپنے خیال کے مطابق مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور تحفظ وبقاء کا ضامن فارمولا پیش کیا......

ان حضرات نے واضح طور پر کہا کہ پاکستان کو مختلف ٹکڑوں میں جو ریاست مل جائے گی، وہ خطرناک جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ چنانچہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم اور ان صوبوں کی جنگی اہمیت کے حصوں کا بھارت میں چلے جانے اور پنجاب کی تحصیل گورداسپور کی وجہ سے کشمیر پر بھارت کے تسلط وغیرہ پر ان حضرات نے سختی سے تنقید کی اور اسے پورے برصغیر کے مسلمانوں کے غیریقینی مستقبل کا پیش خیمہ قراردیا۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اس جغرافیائی اتحاد کو ختم کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے گی۔ اس سلسلہ میں لارڈ لنگھتکو او لارڈویول کے واضح الفاظ ان کے سامنے رہے۔ اور آج سقوط ڈھاکہ پر ماؤنٹ بیٹن کے تاثرات نے ان خیالات کی حرف بحرف تائید کی کہ انگریزی سامراج اپنے عیارانہ منصوبوں کے ذریعہ برصغیر کے مسلمانوں سے ایک نہ ختم ہونے والا انتقام لینا چاہتے تھے۔

ان حضرات کے تمام خدشات اور اندیشوں کو غلط ثابت کردکھانے اور غلطیوں کی تلافی صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ پاکستان قائم ہوتے ہی ہم یہاں اسلام کی مکمل حاکمیت قائم کردیتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور ہم نے ان تمام بلند بانگ دعوؤں ہی سے انکار کردیا جو برصغیر کے مسلمانوں میں بے مثال دینی جوش وخروش کا سبب بن کر انہیں خاک وخون کی گھاٹیوں میں اتارنے کا سبب بنے تھے۔ یہ ایک طویل اور شرمناک کہانی ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے لیکر دسمبر ۱۹۷۱ء بلکہ آج تک کے عرصے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ حضرت مدنیؒ اور ان حضرات کے اخلاص اور للٰہیت کے لیے یہی کافی ہے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد علی وجہ البصیرت مخالفت کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے خطوط، بیانات، مکاتیب اور نجی پیغامات کے ذریعہ نہ صرف اسے تسلیم کرنے پر زور دیا بلکہ یہاں رہنے والے تمام متعلقین کو حکم دیا کہ اب اپنی مساعی اس ملک کی حفاظت سالمیت اور یہاں اسلام کے غلبہ پر مرکوز کردیں۔ اور آج حضرت مدنیؒ سے وابستہ لاکھوں علما، مشائخ کی جماعت اور بے شمار معتقدین ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہوکر اپنا تن من دھن اس ملک کی ترقی اور یہاں اسلام کے غلبہ ونفاذ میں لگے ہوئے ہیں۔ مخالف جو بھی کہیں مگر کلمۃ الحق منکرات کی مخالفت اور معروفات کی اشاعت میں "لایخافون فی اللّٰہ لومۃ لائم" کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ع کچھ ہوئے تو یہی رندان بادہ خوار ہوئے

پاکستان جس تشریح لاالہ الا اللّٰہ سے کی جاتی تھی کیا شیخ الاسلام جیسے عارف باللّٰہ اور عبد کامل کو اللّٰہ کی حاکمیت گوارا نہ تھی؟ کہ وہ اس شدومد سے اس کی مخالفت کرتے رہے مگر وہ جس کی مومنانہ فراست ان دعوؤں کی حقیقت دیکھ رہی تھی اس تعجب کو انہوں نے اس طرح دور فرمایا:

"بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو یہ دھوکا دیا جارہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت بطرز خلفائے راشدین قائم کی جائے گی۔ یہ خواب تو نہایت شیریں ہے۔ کاش! ایسا ہو اگر اس کا ذمہ داران لیگ اطمینان دلادیں تو ہم اراکین جمعیت سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ لوگ جن کو دین اور مذہب اسلام اور شعائر اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں نہ صورت اسلامی ہے نہ سیرت وہ اسلامی حکومت قائم کریں اور مذہب کے اصول وضوابط پر بطرز خلفاء راشدین چلائیں وہ حضرات جن میں اور دین ومذہب میں وہ تعلق ہو جو اندھیرے کو روشنی سے ہے اور آگ کو پانی سے ہے وہ دین ومذہب کا احیاء کریں۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا وہ اقلیت پنجاب اور بنگال کی (جس کی تباہی میں اسی اقلیت نے بنیادی کردار ادا کیا۔ سمیع) جو کہ معمولی اقلیت ہے، یعنی صرف پانچ یا سات عدد سے وہ ایسا ہونے دے گی، اور

اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو کیا مسلم اقلیت والے صوبوں میں اس کا ایسا ردعمل نہ ہوگا کہ وہاں خالص ہندوراج اور رام راج قائم کیا جائے۔ (خطبۂ صدارت اجلاس سہانپور ص ۴۰) اور جب ایسے اندیشوں کے اظہار کی پاداش میں اپنے دور کے سب سے بڑے ولی اور اللہ کی مقرب شخصیت کو اس وقت کی ہرگالی، دشنام، ایذا رسانی اور توہین سے مسلم قوم نے نوازا تو ان کے ایک جان نثار مولانا معاصر ہونا احمد سعید دہلوی مرحوم چلا اٹھے اور کہا کہ:

"پاکستان ایسا ہی ہوگا، جہاں مذہب اور اہل مذہب کے ساتھ اس قسم کا وحشیانہ سلوک کیا جائیگا۔ اس پاکستان میں علماء حق کو رائے کی آزادی میسر نہ ہوگی۔ اس پاکستان میں کیا آپ نماز، روزے اور شعائر اسلامیہ کی چہل پہل دیکھ سکیں گے بلکہ وہ پاکستان تو فسق وفجور کی منڈی ہوں گی جہاں سب کچھ ہوگا اور نہیں ہوگا تو دین الہیٰ کا تذکرہ کہیں نہیں ہوگا۔ (تقریر سحبان الہند ص ۴) ایک طرف یہ کہا جارہا تھا، دوسری طرف اسلام کے مقدس نام پر ان اندیشوں کی تضحیک کی جارہی تھی، کس کا قیاس صحیح نکلا؟ اسکا جواب اپنی قومی زندگی کی چوبیس سالہ تاریخ (اب پچاس سالہ (راشد) کے اوراق میں ڈھونڈیئے، مگر شروع ہی سے اسلامی نظریات، شعائر اللہ دینی اقدار اور اسلام کے نظام حکومت ومعاش کو پنپنے دیا گیا ہوتا، تو شاید یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا، مگر ہائے رے معصوم تمنا۔

—— یہ تو رہا پاکستان میں شریعت الہیہ کے اجراء اور نفاذ کا مسئلہ جس انداز میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فارمولا بنایا گیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ اپنی فراست باطنی کی وجہ سے اس میں آنے والے پرخطرات ہجوم کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور اسے مسلمانوں کی اس برصغیر میں تباہی کا واشگاف الفاظ میں پیش خیمہ قرار دینے لگے۔ فرمایا:

"یہ صحیح ہے کہ پاکستان اور اسلامی حکومت کے نعرے بڑے دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ دو اسلامی حکومتوں کے قیام کا تخیل عام مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا سرور اور جوش پیدا کردیتا ہے۔ اور یہ بھی سچ صحیح کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کافی اختلافات ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ محض ہندوؤں کی تنگ دلی سے شاکی ہوکر ہم ایسی غلطی کر بیٹھیں جو مستقبل میں ہمارے لیے تباہ کن اور ملت کیلئے باعث بربادی بنے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ بنگال اور پنجاب کی حکومتیں اتنی طاقتور نہیں ہونگی کہ وہ بیرونی حکومتوں کے سازباز اور انکی درازدستیوں کا مقابلہ کرسکیں۔ اس لیے یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ہندوؤں سے تو مفروضہ آزادی حاصل کرلیں مگر اس مفروضہ آزادی کے بدلہ میں غیر ملکی حکومتوں کی ویسی ہی غلامی میں مبتلا ہوجائیں جیسی

کہ آج ہمارے سروں پر نافذ ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بدترین بدقسمتی ہوگی۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم معاملات کو محض ہندودشمنی کی عینک سے نہ دیکھیں، بلکہ پاکستان کے سوال پر سنجیدگی سے غورکرکے یہ فیصلہ کریں کہ آیا یہ پاکستانی حکومتیں خود ہمارے لیے باعث رحمت ثابت ہوسکیں گی یا نہیں ؟۔ آیا یہ اپنے تحفظ کا مناسب بندوبست کرسکیں گی یا نہیں ؟۔ آیا یہ اتنی طاقتور ہونگی یا نہیں کہ بین الاقوامی سیاست میں اپنا وقار قائم رکھ سکیں ؟۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو دانائی کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے لیے ماتقی اختیارات حاصل کرکے متحدہ ہندوستانی وفاق میں شامل رکھا جائے اور بجائے علیحدہ ہوکر دوسروں کے غلام بننے کے ہندوؤں سے مل کر نہ صرف اپنی آزادی برقرار رکھی جائے بلکہ متحدہ ہندوستان کے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ملت اسلامیہ کی اس طرح اندرونی اصلاح کی جائے کہ وہ زندہ اور طاقتور قوم محسوس ہونے لگے۔ " مارننگ نیوز " کا یہ بیان صحیح ہے کہ اب دنیا کی تقسیم اور علیحدگی کی مہمل سیاسی پالیسی کو چھوڑتی جارہی ہے۔ اسلیے مسلسل تجربات نے ثابت کردیا ہے کہ اس تنازع للبقاء کی دنیا میں صرف طاقتور زندہ رہ سکتے ہیں۔ کمزور، چاہے وہ کتنے ہی حق پرور کیوں نہ ہو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

مان لیجئے کہ قیام پاکستان کے لیے اچھے دلائل موجود ہیں مگر یہ اچھے اور خوبصورت دلائل جاپان کو بنگال پر اور روس کو پنجاب اور سرحد پر حریصانہ نگاہیں ڈالنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ کیا آزادی وانصاف کے تمام الفاظ ملک گیری کے آرزومندوں کو پاکستان کے کمزور ممالک کی تسخیر کی ارادوں سے باز رکھ سکتے ہیں ؟۔ اگر کوئی اس معاملہ میں دیانتداری کا ذرا بھی شبہ رکھتا ہے تو وہ بیوقوفوں کی جنت کا ساکن ہے۔ اس دنیا میں، جہاں حق کے مقابلے میں طاقت کا راج ہے، پاکستانی حکومتیں محض اس بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتیں کہ مسلمانوں کوآزاد رہنے کا حق ہے۔ اور بحثیت ایک علیحدہ قوم کے ان کو ضرور آزاد رہنا چاہیے۔ (نئی زندگی، کتاب دوم ص ۱۹ از مولانا مدنیؒ) بیرونی حکومتوں سے سازباز، یا انکی درازدستیوں کا مقابلہ، غیرملکی حکومتوں کی غلامی، اپنے تحفظ کا مناسب بندوبست کرسکیں گی یا نہیں ؟۔ روس کی پنجاب وسرحد پر حریصانہ نگاہیں، ملک گیری کے آرزومندوں کے پاکستان کے کمزور حصوں پر تسخیر کے ارادے اور اس قسم کے دیگر جملوں پر غور کیجئے تو آج کے بدترین سانحہ " سقوط مشرقی پاکستان " کے خطوط پر اس کی تفسیر وتشریح آپ کو مل سکے گی۔ حضرتؒ اور ان کی جماعت کا شائع کردہ لٹریچر آپ کو ایسی باتوں سے بھرا ملے گا، ذہن سیاسی آلائشوں سے صاف رکھ کر بھی تو کوئی طالب العلم ماضی اور تاریخ پر نگاہ باز رفت ڈال سکتا ہے۔ پنجاب بنگال کی تقسیم پر یہ حضرات ایک لحہ کیلئے بھی آمادہ نہیں ہورہے تھے اور اس لیے کہ ــــــ :

" پس پاکستان قائم ہوتے ہی بنگال اور آدھا پنجاب مسلمان کھودیں گے۔ اب رہا آسام وہ پورا کھودیں گے۔ سوائے ضلع سلہٹ کے، پس مسلم لیگ کی پاکستان کا یہ کیا نتیجہ ہوگا۔ بنگال میں ایک کوٹھری ملے گی جس کے یورپ ہندو راج، پچھم ہندوراج اور اتر ہندوراج، آسام بالکل اور آدھا پنجاب نکل جائے گا۔ نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کا پاکستان مسلمانوں کے لیے خودکشی سے کم نہیں ہم بھی ہندوراج میں جاکر تباہ ہوئے اور اکثریت صوبے والے بھی تباہ ہوئے"۔ (قومی کارکنوں کے نام ہدایات صفحہ ۱۶،)۔ تقسیم پنجاب اور پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی کو حضرت مدنیؒ قسمۃ ضیزی اور نامراد بٹوارہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

".جمعیت العلماء ہند ان تاریک پہلوؤں کی بنا پر کانگریس کی حالیہ تجویز تقسیم پنجاب یعنی تقسیم در تقسیم کو ایک لمحہ کیلئے بھی گوارا نہیں کرسکتی اور یہ تقسیم برطانوی سامراج کا آخری ہتھیار ہے۔

(خطبہ صدارت اجلاس لکھنؤ ۱۹۴۹ء) اس وقت ان تاریک پہلوؤں کو ہر حیثیت سے واضح کرتے ہوئے کہا گیا کہ دونوں حصوں کو الگ الگ بری، بحری اور فضائی فوج رکھنا پڑے گی۔ اور مشرقی حصہ خاص طور پر ایک جزیرہ بن جائیگا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی میں مزید تلخی بڑھے گی۔ مجموعی ہندوستان اور وفاقی حصوں میں مسلمان بے بس اقلیت ہوجائیں گے۔ پنجاب اور بنگال دونوں کے اہم حصے کاٹ دینے سے ان کی موجودہ اہمیت ختم ہوجائے گی۔ مالی بحران پیدا ہوگا۔ اور پاکستان اس حالت میں صحرا اور بنجر علاقوں کا چوکیدار رہ جائے گا، اور پھر مشرقی ومغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے ملانے والے راستہ کا سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔ (ملخصاً از نئی زندگی خاص نمبر ۱۹۴۹ء ص ۴۷)

اس نازک جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے آگے چل کر پاکستان جن داخلی مسائل سے دوچار ہوسکتا تھا اور بعد کے حالات نے اس کی ۱۰۰ % فیصد تصدیق کردی۔ اس سے آگاہ کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں: ". بحثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پسماندگی، پانچ میں سے تین صوبوں کا خود مکتفی نہ ہونا۔ ۴۰۰۳۹ فیصد کی منظم اور مؤثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستان کے وہ داخلی مسائل ہوں گے جن سے حکومت عہدہ برآنہ ہوسکے گی۔ اور اپنی حالت سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیرملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا۔ (آج ہم میں سے ہر شخص غیر ملکی قرضوں کے سود میں دبا ہوا ہے۔ سمیع) مزید برآں یہ حکومت اپنے وسائل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کرسکے گی۔ اس لیے ملک کے دفاع کو دولت مشترکہ برطانیہ (سیٹو، سنٹو، بغداد پیکٹ وغیرہ، سمیع) کے دفاع سے وابستہ کرنا ہوگا۔ (بعد میں برطانیہ کی جگہ

امریکہ نے لے لی ۔ سمیع) یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ (یا پھر امریکہ اور چین جو سب ملت واحدہ ہیں ۔ سمیع) کی سیاسی واقتصادی غلامی میں تبدیل ہوجائے گا ۔ اپنی کمزوری اور تباہ حالی کی وجہ سے اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہوسکے گی اور نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی مؤثر امداد کرسکے گی ۔ بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی (اور اسی روس اور برطانیہ نے مشرقی پاکستان کے المیہ میں بنیادی کردار ادا کیا ۔ ع قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید ۔ سمیع) ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا ۔ (مکتوبات ج ۲ ص ۵۷)

جغرافیائی صورتحال کی بنا پر یہی کھٹکا قیام پاکستان کے بعد ان رہنماؤں کو لگا رہا ۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اپنی کتاب " ہماری آزادی " میں واشگاف الفاظ میں آنے والے خطرہ کی نشاندہی کی اور فرمایا :

" مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے ، کہ جغرافیائی صورتحال ان کے لیے ناموافق ہے ۔ مسلمان سارے برصغیر میں کچھ اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ ایک سمٹے ہوئے علاقے میں ان کی الگ ریاست بنانا ناممکن تھا ۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مشرق اور شمال مغرب میں تھے ۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں ۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں...... یہ صورت حال اس وقت تھی اور اب بھی ہے ۔ کون اسکی توقع کرسکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلافات دور ہوجائیں گے ، اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بن جائیں گے ۔ خود مغربی پاکستان کے اندر سندھ ، پنجاب اور سرحد اپنے اپنے جداگانہ مقاصد اور مفاد کیلئے کوشاں ہیں ۔ بہرکیف اب تو جو کچھ ہونا تھا ہوچکا ۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے ۔ اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراک عمل سے کام لیں ۔ (ہماری آزادی صفحہ ۴۵۳ ، صفحہ ۴۵۴) ۔

سیدنا مولانا مدنیؒ نے تو ایک مکتوب میں پاکستان کے لیے جذبہ نصح اور خیرخواہی کی اظہار کے ساتھ ساتھ یہاں تک اپنے خطرات کا اظہار کیا کہ : موجودہ شکل میں یہ نقشہ ۲۳ ۔ ۲۴ سال بمشکل قائم رہ سکے گا ۔ اور آہ ! کہ یہی چوبیس سالہ عدد ہماری بربادی اور تباہی کا عنوان یا حرف آخر بن گیا ہے ۔ کاش ! قیام پاکستان کے بعد سہی مگر ہم اللہ کے ایسے برگزیدہ بندوں کی اندیشوں کو درخور اعتناء سمجھ

لیتے اور اس ملک میں اپنی تقدیر بنانے کی مخلصانہ سعی کرتے تو ان تمام خدشات اور اندیشوں کی تلافی کرلیتے اور یہ مختصر مگر پر خطر خطہ نہ صرف اسلام کی سطوت وشوکت کا ایک مثالی ریاست بن جاتا بلکہ اسلام کی بدولت ہم اسے اغیار اور اشرار کے شر سے محفوظ کرلیتے اور پورے عالم اسلام کی قیادت کا اہل بناکر اسے اسلام کا حصار اور عالم اسلام کی امیدوں کا مرکز بنالیتے اور اس طرح آج جان لیوا او جان نثار سرفروشوں کے ارواح طیبہ کو مزید آسودگی نصیب ہوتی جنہوں نے اسلام کے نام پر اس ملک کے لیے اپنی جانیں اور عصمتیں نچھاور کردیں، یا وہ لوگ جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک انگریز کے خلاف جہاد مسلسل کے زرین ابواب اپنے خون سے رقم کئے۔ ان حالات کو دیکھ کر حضرت شیخ الاسلامؒ کے حساس قلب پر کیا کچھ گذرا ہوگا۔ فرماتے ہیں: " ہماری سنی جاتی تو آج وہ مشکلات درپیش نہ ہوئیں اس وقت مسلمان جمہوریہ ہند میں ۲۷ فیصد ہوتے جوکہ موثر اقلیت ہے مگر آج چار کروڑ ہیں جو ۹ یا ۱۰ فی صد پڑتے ہیں۔ (مکتوبات ج ۲ ص ۲۲۳) " گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مسلم اکثریت کی حکومتیں ہوئیں جو تمام داخلی معاملات قانون سازی، نظام تعلیم، اقتصادی نظام کے قیام معاشرتی او تمدنی مسائل، پرسنل لاء وغیرہ میں پوری بااختیار ہوتیں، پورے سندھ میں مسلمانوں کے مذہبی ادارے اوقاف، مساجد، مقابر، اور ان کا کلچر اور تہذیب وتمدن وغیرہ محفوظ تھا۔ (مکتوبات ج ۲ صفحہ ۸۱)۔ معلوم نہیں ان مسلمانوں کے دلوں کی کیا کیفیت ہوگی، جو اسی پاکستان کی سرزمین ڈھاکہ میں اسی جرم کی پاداش میں لاکھوں بہاریوں اور غیروں بنگالیوں کو خاک وخون میں تڑپتا اور ان کی مقدس عصمتوں کو لٹتا ہوا دیکھ کر بھی بے بس ہیں۔ ان بہاریوں کو جن کا نعرہ تھا کہ ہم بہار کے مسلمان پاکستان کیلئے خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔ (ڈان ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء)

اجڑے اور شکستہ دل آزاد ہوتے ہیں کہ جیسے چاہیں اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کو تاثرات اور جذبات سے آباد کرالیں۔ نہ ملت کی خیرخواہی کسی کا اجارہ ہے۔ تاریخ خود بے رحم کسوٹی ہے۔ بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہوچکا یہ سارے اندیشے پاکستان قائم نہ ہونے کی صورت میں لائق اعتناء تھے۔ اب جبکہ یہ اندیشے " صداقتیں " بن چکی ہیں تو ہماری نجات اور تمام بربادیوں کی تلافی کی ایک ہی راہ رہ گئی ہے کہ اب اس رہے سہے ملک کو صحیح معنوں میں پاکستان بنادیں۔ اللہ کے نام میں اتنی عظمت اور تاثر ہے کہ اس کے سہارے سے ایک چھوٹا ساخطہ بھی پوری دنیائے کفر کو لرزہ براندام کرسکتا ہے۔ اس طرح ہندوستان سے عظمت اسلام کا وہی سکہ ایک بار پھر منواسکتے ہیں جو تقریباً ہزار سال تک منوا چکے تھے۔ کاش! اسلامیان برصغیر اس سرزمین میں اپنی جان تمنا اور لیلائے امید

بقیہ ص۲۶ پر
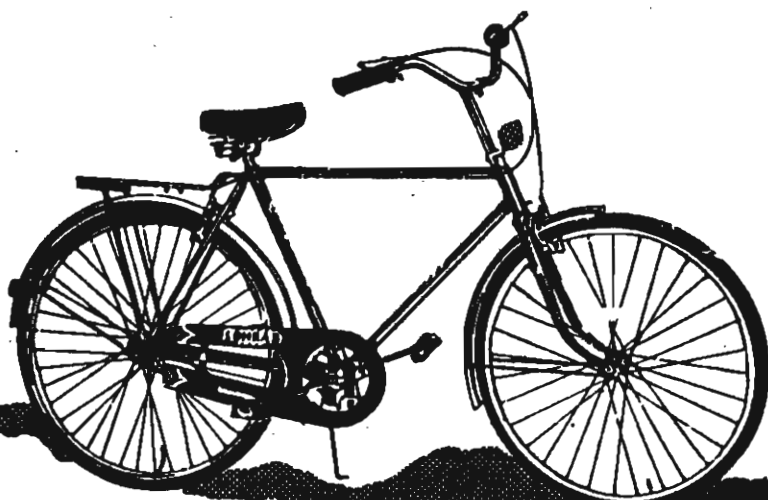
جناب مظفر عباسی صاحب
(مری)

ہمارے پچاس سال ؟

انگریز کو گئے برصغیر پاک وہند کو تقسیم ہوتے اور پاکستان کو قائم ہوئے پچاس سال ہوچکے ہیں ۔ ہم آزاد ہیں ۔ اپنا ملک اور وطن ہے اپنی حکومت اور اقتدار ہے ۔ اور ہم پچاس سالہ گولڈن جوبلی، جشن مسرت اور آزادی کی عید منارہے ہیں ۔ جوش خوشی کا ہو یا غم اور غصے کا اس میں عام طور پر ہوش قائم نہیں رہتے اور پھر ایسا جوش جس میں بارہ کروڑ جوان، بوڑھے اور مرد عورتیں شریک ہوں اور یہ لوگ جو کرکٹ میچ میں فتح وشکست کے نتیجہ میں پر جوش ہوجاتے ہیں ۔ ان سے ہوش کی توقع اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔ غرض ہم خوش ہیں اور خوشی ومسرت کے جوش میں ہوش کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں ۔ ان حالات میں میری باتیں جو میرے خیال میں سچی ہیں کون گوارا کرسکتا ہے ۔ تاہم لکھ رہا ہوں اس لیے کہ لکھنے اور حتیٰ المقدور سچ لکھنے کی عادت ہے ۔ " الحق " کے مدیر محترم کا ارشاد ہے کہ کچھ کہوں اور پھر کہنے اور لکھنے کا موقع اور موسم بھی ہے ۔ ان حالات میں چپ رہ کر " گونگا شیطان " کہلانا کیسے گوارا کرلوں ۔ اچھا تو مجھے لکھنے اور عادت سے مجبور ہوکر سچ لکھنے کی اجازت دیں ۔ (شکریہ) ۔

آئیے بات آزادی کے مفہوم سے شروع کرتے ہیں ۔ ہاں ! ہاں ! یاد آیا آزادی کے مفہوم سے تو قارئین واقف ہیں چلو یہ نعمت اپنے ہاں نہ سہی گردوپیش اور قرب وجوار کے ملکوں میں تو ہے سائنس نے ترقی کی اور ابلاغ کی سہولتیں پیدا کردی ہیں ۔ ان حالات میں انسان جاننے کی خواہش اور کوشش کے بغیر ہی بہت کچھ جان لیتا ہے ۔ ہمارے موجودہ اور مرحوم حکمرانوں نے ہمیں سلانے اور گردوپیش کے حالات سے بے خبر رکھنے کی پوری پوری کوشش فرمائی ہے لیکن انہیں اس کوشش میں حسب منشا کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ۔ اور ہمسایہ ملک افغانستان میں نوجوان طالب علموں نے جنہیں صرف طالبان کہا جاتا ہے بے شمار حقائق کو بے نقاب کردیا ہے ۔ اور ہم لوگ

آزادی کے مفہوم سے اتنے بے خبر نہیں رہے جتنا ہمارے حکمرانوں کی کوششوں کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔ تاہم آزادی کے مفہوم پر بات چیت کی مزید ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے " جوبلی " اور " گولڈن جوبلی " کے معنی و مفہوم کی بات زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ " جوبلی " عربی زبان کی بیٹی عبرانی زبان کا لفظ ہے، جو اصل میں " یوبل " تھا
انگریزوں نے ی کو۔ ج۔ بنادیا ہے اور یوں ہم نے اپنے آقاؤں کے انداز میں " یوبلی " کو جوبلی بنا لیا ہے۔ یاد آیا کہ انگریزوں نے " یعقوب " کی۔ ی۔ کو۔ ج۔ سے بدل کر جیکب۔ یوسف۔ کی۔ ی کو۔ ج سے بدل کر جوزف۔ اور " یوحنا " کی۔ ی۔ کو۔ ج۔ سے بدل کر جوھن اور جوحنا بنالیا ہے۔ انگریزوں کو انکے پادریوں نے اپنے انبیاء کرام اور بزرگوں کے اسمائے مبارکہ میں اس تحریف سے منع نہیں کیا اور منع کرتے بھی کیسے انہوں نے خدا کے رسولوں کے پورے نظام اور شریعت کو بدل بلکہ مسخ کردیا تھا۔ غرض انگریزوں نے تمام اہل یورپ نے نہیں صرف انگریزوں نے ی۔ کو۔ ج۔ سے بدل کر " یوبلی " کے جوبلی بنادیا ہے۔ اور ہم نے یہ میڈان انگلینڈ کی اصطلاح اسی طرح اپنالی ہے۔ تورات کی تیسری کتاب " احبار " کے پچیسویں باب میں " یوبلی " کی پوری تشریح موجود ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہر پچاسواں سال " یوبلی " یعنی آزادی کا سال ہوتا ہے۔ اس سال تمام غلام از خود آزاد ہوجاتے ہیں۔ قرضے ختم ہوجاتے ہیں مرہونہ اشیا اصل مالکان کو مل جاتی ہیں۔ قیدی رہا ہوجاتے ہیں اور جرمانے معاف کردیئے جاتے ہیں۔ اس " یوبلی " یعنی آزاد کے سال گائے بیل اور مال مویشی تک آزادی اور آرام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پوری قوم پورا سال آرام کرتی ہے نہ کھیتوں میں کام کرتی ہے، نہ بازاوروں میں بس آرام اور آزادی سے لطف اٹھایا جاتا ہے۔

یہودیوں کے مذہب میں ہر ساتواں دن " سبت " یعنی آرام کا دن ہوتا ہے، اور سات سالوں کو ایک دن فرض کیا جائے تو ہر پچاسواں سال سبت کا سال ہوتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ سبت کے سال تم نے کوئی کام نہیں کرنا اور تمھارے چھٹے سال کی محنت میں ایسی برکت ڈالے گا کہ تمھیں ساتویں یعنی سبت کے سال محنت کے بغیر سب کچھ مل جائے گا۔

گذشتہ سال " جوبلی " کے مفہوم کے بارے میں غالباً " نیوزویک " میں ایک دلچسپ مضمون پڑھا تھا۔ مضمون نگار نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ " اسرائیل " میں یہودیوں کی مذہبی حکومت ہے۔ اس حکومت کو قائم ہوئے ۵۰ سال ہونے والے ہیں۔ گویا اسرائیل

مستقبل قریب میں سبت اور یوبلی (جوبلی) کی خوشیاں منائے گا ۔ اس سال تمام کاروبار مملکت موقوف رہے گا ۔ ان حالات میں عربوں اور بالخصوص فلسطینی عربوں کی طرف سے حملے کی صورت میں کیا حکمت عملی اپنائی جائے گی ؟ مضمون نگار غالباً امریکن تھا ۔ ورنہ اسے یہ بھی واضح کرنا چاہئے تھا کہ یورپ کے یہودیوں نے فلسطین کے اصل باشندوں سے جو زمینیں خریدی تھیں انکا کیا بنے گا ؟ توریت کے قانون کے مطابق وہ زمینیں اصل مالکان کو واپس مل جانی چاہئیں ۔

پاکستان کی پچاس سالہ " جوبلی " بلکہ " گولڈن جوبلی " کی نسبت سے ہمیں آزادی اور آزادی کے تقاضوں کے بارے میں لکھنا چاہئے تھا ، اور " الحق " کے مدیر اعلیٰ کا حکم بھی یہی تھا لیکن اس خیال سے کہ اسی عنوان پر لکھنے والے بہت کچھ لکھ رہے ہیں ۔ نیز میں جو بات کرونگا وہ " الحق مرّ " کے مصداق ہمارے پرجوش قارئین کو شاید ناگوار گزرے ۔ اس لیے زیب داستان کے طور پر جوبلی کے عنوان پر چند باتیں لکھ کر اپنے حصے کی کالم نگاری کا قرض اتارنے اور فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ رہی بات آزادی کی سو ہم بارہ کروڑ کی تعداد پر مشتمل ایک قوم کے اعتبار سے آزاد ہیں بشرطیکہ قوم کا وہی مفہوم سامنے رکھا جائے جو ہمارے ہاں نصاب میں داخل معاشرتی علوم کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے ۔ رہا اسلام اور اسکی معاشرت کے بارے میں اصطلاحات میں آزادی اور حریت کا جو مفہوم ہے ۔ اس کے حوالے سے بات کی جائے تو ہم کیا دنیا کی کوئی قوم بھی آزاد نہیں ۔ اگر سیاسی آزادی ہے تو جہالت کفروشرک ، رسومات بد، ذات پات ، ملک وطن اور رنگ ونسل کے فراعنہ کے سب غلام ہیں ۔ امریکہ جو آزادی کا داعی اور لیڈر بنا پھر رہا ہے بدترین قسم کی غلامی کا شکار ہے ۔ آزادی کا دنیاوی اور رائج الوقت مفہوم سامنے رکھا جائے تو بھی ہم کسی اچھی حیثیت کے مالک او بہتر مقام پر نہیں ۔ پچاس سال ہوگئے اور ہم ابھی تک :-

(۱). اپنا تشخص قائم کرنے کی بجائے خود اسی کا تعین نہیں کرسکے کہ ہم ہیں کون ؟

(۲). ہماری زبان کیا ہے ؟ ہم طے نہیں کرسکے ۔ (۳). ہمارا دین اور مذہب کیا ہے ؟ ہم فیصلہ نہیں کرسکے ۔ (۴). ہمارا قانون اور آئین کیسا ہو ہم فیصلہ نہیں کرسکے ۔ (۵). ہمارا نظام تعلیم سرتا پاغلط ہے ۔ ہمارے ماہرین تعلیم ایک بار نہیں صدہا بار اعلان کرچکے ہیں کہ یہ آزاد قوم کا نظام تعلیم نہیں لیکن ہم اسے درست نہیں کرسکتے ۔ (۶). ہمارا عدالتی نظام اس درجہ غلط اور فرسودہ ہے کہ اس نظام کے زعماء جب ملازمت سے فارغ ہوتے ہیں تو انکا سب سے پہلا بیان یہی ہوتا ہے کہ یہ نظام خلق خدا کو انصاف دینے میں ناکام ہے ۔ (۷). معاشی اعتبار سے ہم دنیا کے پسماندہ ترین

قوموں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ کل تک ہم زرعی پیداوار میں دوسروں کی مدد کرتے تھے اور آج حالت یہ ہے کہ ہم سات سمندر پار واقع ملک امریکہ سے گندم درآمد کرتے ہیں۔
(۸)۔ دین اور مذہب کے بارے میں ہماری پسماندگی بلکہ افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ ہمارے حکمران ہمیں خوشخبری کے انداز میں بتاتے ہیں کہ آپ لوگ مطمئن رہیں افغانستان میں "طالبان" کا برپا کیا گیا انقلاب پاکستان نہیں آئے گا۔ (۹)۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کہا جاتا تھا کہ انگریز اور ہندو ہمارے دشمن ہیں اور یہ ہماری ترقی اور خوشحالی کی راہ میں حائل ہیں۔ آج پچاس سال ہوئے ہماری دو نسلیں آزادی میں جنم لیکر پروان چڑھ چکی ہیں۔ نہ انگریز ہے اور نہ ہندو لیکن ہم نے نہ ترقی کی اور نہ خوشحال ہوئے۔ (۱۰)۔ پہلی عالمی جنگ میں ہم نے اسلامی ملک ترکی کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا اور بہانہ یہ کیا کہ کیا کریں انگریزوں کی حکومت ہے۔ غلام ہیں، مجبور ہیں۔ حکم کے بندے اور تابع ہیں اس لیے بھائیوں کے خلاف تلوار اٹھا رہے ہیں۔ لیکن کل کی بات ہے کہ ہم نے اپنے سے بہتر اور زیادہ صلاحیت رکھنے والے مسلمان ملک عراق کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور یہ حصہ اور جنگ میں شراکت کویت یا سعودی عرب کی حمایت میں نہیں بلکہ اپنے اصلی حقیقی اور معنوی دشمن امریکہ کی حمایت میں کی ہے۔ (۱۱)۔ ہمسایہ ملک افغانستان میں امریکہ کے منصوبے اور پروگرام کے عین مطابق ہم نے مداخلت کی۔ لوگوں کو کہا کہ ہم روس کی دھریت اور سوشلزم کے خلاف جہاد کررہے ہیں جبکہ چین جو دھریہ بھی ہے اور سوشلسٹ بھی اس کی دوستی کا فخریہ اعتراف اور اعلان کرتے پھر رہے ہیں۔ (۱۲)۔ امریکہ کے ذیلی ادارہ یو۔ این۔ اور غلامی پر ہمیں فخر ہے اور اسکی قیادت اور سیادت کا جوا گردن پر رکھے کوریا، ویت نام، کیوبا، لیبیا اور عراق وغیرہ بے شمار ملکوں کے خلاف ظالمانہ کاروائیوں میں شریک ہیں۔ (۱۳)۔ آزادی کے پورے پچاس سالوں میں ۲۵ سال مارشل لاء کے تحت رہے اور اس مدت کو بھی آزادی میں شمار کرتے ہیں۔ (۱۴)۔ محترم ایوب خان صاحب او جناب ضیاء الحق صاحب کی ذات ان کے ارادوں اور نیات کے قطع نظر ہم زبانی کلامی انہیں آزادی اور جمہوریت کے غاصب قرار دے رہے ہیں اور ان کی باقیات کو نہ صرف باقی رکھے ہوئے ہیں بلکہ کندھوں پر سوار اور سرآنکھوں پر بٹھائے ہوئے ہیں۔ (۱۵)۔ امریکہ کے وزیر دفاع نے اپنی قوم کے سامنے کھلے بندوں اور واضح لفظوں میں یہ حقیقت بے نقاب کی کہ ہم (امریکہ) دنیا بھر کی اقوام کو ان کے حکمرانوں کے ذریعہ غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے حکمران کھلے کانوں یہ اعلان سننے اور کھلی آنکھوں سے

حقائق کو دیکھنے کے باوجود آزادی کا جشن منارہے ہیں۔ (۱۶)۔ ساری دنیا کے ہم مقروض ہیں۔ قرض لیکر قرض کا سود ادا کرتے ہیں۔ اور مزید قرض لیکر عیاشی کا سامان درآمد کرتے ہیں۔ کوئی پاکستانی امریکہ کو ہیروئن برآمد کرے تو ہم اسے کشتنی قرار دیتے ہیں، لیکن امریکی ساحر ہماری تہذیب کے خلاف ہر قسم کا لٹریچر، کتابیں، رسالے، اخبارات اور فلمیں ہمارے ہاں پھیلائیں تو ہم انہیں ثقافتی امداد جان کر شکریہ سے قبول کرتے ہیں۔ (۱۷)۔ اسلام نے آزادی کا مفہوم بتایا ہے کہ سب انسان آزاد اور باہم برابر ہیں۔ اگر فرق ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ لیکن ہم نے امیر غریب، مالک مزدور، جاگیردار اور مزارع، ووٹر اور لیڈر، افسر ماتحت کے گروہوں اور فرقوں میں خلق خدا کو بانٹ کر انہیں غلام بنا رکھا ہے اور تاثر یہ دیا جارہا ہے۔ کہ تم آزاد ہو اس لیے کہ تمہارا صدر تمہارا وزیراعظم اور تمہارا سردار اس ملک کا اور دیس کا باشندہ اور ووٹر ہے۔ جس کے تم باشندے اور ووٹر ہو۔ (۱۸)۔ آزاد اور ترقی یافتہ اقوام کے کتے اور دوسرے پالتو جانور جدید ترین طبی سہولتوں سے مستفید ہورہے ہیں، اور ہمارے ہاں تو آدم وحوا کی اولاد دوا کی ایک ایک خوراک کو ترس رہی ہے۔ (۱۹)۔ امریکہ میں کوئی شرابی بدمست مارا جائے تو اس کے قاتل کی تلاشی میں ہم سرگرم عمل ہوجاتے ہیں۔ اور جس پر مقتول کے ساتھی قتل کا شبہ ظاہر کریں۔ ہم اسے گرفتار کرکے امریکی حکمرانوں کے حوالے کردیتے ہیں جبکہ اپنے ہاں روزانہ درجنوں بیسیوں اور سینکڑوں قتل ہوتے ہیں تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ (۲۰)۔ حکمرانوں کی بستیوں کے قریب سے دھواں دیتی ہوئی گاڑی گزر جائے تو چالان ہوجاتا ہے اورعوام کے گھروں کے گرد گندگی کے ڈھیر کسی کو نظر نہیں آتے۔

(۲۱)۔ قرض لیکر بڑی کھلی اور ہموار سڑکیں بنائی جاتی ہیں کہ حکمرانوں کو گاڑی چلانے یا گاڑی میں سفر کرتے ہوئے تکلیف نہ ہو اور عوام پینے کے پانی اور روشنی کے چراغ تک سے محروم ہیں۔

کہاں تک عرض کروں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ روشنی کی کوئی کرن اور امید کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہماری غلامی کے طوق اور زنجیریں ۱۹۴۷ء سے پہلے کی نسبت آج زیادہ کڑی اور سخت ہیں۔ اس وقت آزادی کیلئے لڑنا جہاد تھا۔ آج آزادی کا نام لینا بغاوت ہے۔ اس وقت ہم سامراج کے غلام تھے اور آج سامراج کے غلاموں کے غلام ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے۔ اخبارات میں امریکہ کے سیکرٹری دفاع کا بیان شائع ہوا ہے۔ جسمیں کہا گیا ہے کہ پاکستان فوجی افسروں کو

تربیت دینا امریکہ کے اپنے فائدے کی بھی بات ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستانی فوجی افسر کی تربیت سے امریکہ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ بجز اس کہ یہ افسر حضرات امریکی مفادات کے لیے کام کریں، اور کون نہیں جانتا کہ امریکی مفادات پسماندہ اقوام او بالخصوص مسلمان ممالک کی پسماندگی، جہالت غربت وافلاس، بے دینی، بے حیائی اور باہم اختلاف اور قتل وغارت سے وابستہ ہیں۔

افغانستان کے ۸۰٪ فی صد علاقے پر طالبان کی حکومت اور انکا اقتدار ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور اضلاع پر چند لیڈروں نے باغیانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اور امریکہ اپنے حواریوں کے ذریعہ افغانستان میں ایسے حالات پیدا کررہا ہے کہ ان باغیوں کو ان کے زیرتسلط علاقہ پر حکمران تسلیم کرلیا جائے۔ اور پھر ان میں سے کسی ایک کی مدد اور دفاع کو بہانہ بناکر طالبان کی واحد اسلامی ریاست پر حملہ کردیا جائے۔ امریکہ کے وزیر دفاع نے اپنی ایک خفیہ رپورٹ میں جو غلطی سے شائع ہوگئی تھی یہ تسلیم کیا کہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جیسے عرب ریاستیں ہیں جو اپنا دفاع نہیں کرسکتیں امریکی مفادات کیلئے نہایت مفید اور ضروری ہیں۔ اگر کویت کمزور اور چھوٹی ریاست نہ ہوتی تو امریکہ کیلئے عراق پر حملے کے جواز کی صورت پیدا کرنا مشکل تھا۔ چین کو دبانے کیلئے فاموسا اور جنوبی کوریا کی ریاستیں ہیں۔ پاکستان تو ویسے ہی حکمرانوں نے امریکہ کے حوالے کردیا ہے۔ بھارت اورچین کو قابو کرنے کیلئے امریکہ کشمیر میں ایک ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ عربوں کو دبانے کیلئے اسرائیل کی ریاست ہے۔ نیز عرب ریاستوں کا ایک سلسلہ جزیرۃ العرب کے مغربی اور مشرقی کناروں پر موجود ہے۔ اسی نوعیت کا حصہ ہے۔ کراچی، گوادر اور کشمیر میں بھی ایسی ہی ریاستوں کا قیام اسی حکمت عملی اور منصوبے کی صورتیں ہیں۔

بات پاکستان کی آزادی اور پچاس سالہ "گولڈن جوبلی" کی تھی اور ہم امریکہ تک پہنچ گئے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہماری برائے نام آزادی خطرے میں ہے۔ اور یہ خطرہ امریکہ کی طرف سے ہے۔ اس لیے میں نے خوشی کے اس موقع پر ان تلخ حقائق کی طرف اشارہ کرنا ضروری خیال کیا تاکہ خوشی میں ہوش کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ میرا مقصد مایوسی پھیلانا نہیں بلکہ محتاط رہنے اور ماضی کی، کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دور کرکے حقیقی آزادی کے لیے جدوجہد کی دعوت دینا ہے۔

✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠

جناب ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی صاحب (لاہور)

ہمیں پاکستان کی ضرورت کیوں ہوئی ؟

شعائر اسلامی:- مسلمان اور ہندو صدیوں سے برصغیر میں ایک جگہ رہ رہے ہیں ۔ مگر ہندوؤں نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کبھی قبول نہیں کی ۔ ہر ممکن کوشش کیں ۔ معاندانہ کاروائیاں کیں ، معاشی ، معاشرتی ، تہذیبی ، ثقافتی استحصال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔ الغرض ہر سطح پر مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کئے رکھا ۔ اور ہر باران کو منہ کی کھانی پڑی ۔ مسلمانوں کی معاشرت اور روایات ان سے یک سر مختلف تھیں ۔ ہندو اپنے آپ کو آریہ نسل کی اولاد قرار دیتے تھے ، اور اسطرح خود کو برصغیر کی سب اقوام سے بالاتر گردانتے ہیں ۔ جبکہ مسلمانوں کو اپنے شعائر اسلامی پر فخر ہے وہ کسی صورت میں شعائر اللہ کے مقابلہ میں ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے یا انکی برتری تسلیم کرنے پر رضامند نہ ہوتے تھے ، چنانچہ اپنی تہذیب ومعاشرت اور ثقافت کو محفوظ کرنے کیلئے انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ اسلامی حکومت کا مطالبہ کیا ، جہاں اسلامی تہذیب وروایات پروان چڑھ سکیں اور ان کی حفاظت کی ضمانت مل سکے ۔ مگر یہ اس قدر آسان کام نہ تھا ۔

انگریزوں کی برصغیر ہند میں آمد کے بعد دو ایسے نظریاتی گروپ مدمقابل ہوگئے جو دین اسلام کی استہزاء کے ساتھ ایسے افعال کی ترغیب دیتے جو اسلامی شعائر کے قطعاً منافی تھے ۔ بایں ہمہ ہندوؤں نے جو چھ سال تک بوجوہ مغل سلطنت میں خاموشی اختیار کئے رکھی ، اب انگریزوں سے مل گئے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کیلئے صف اول میں آکھڑے ہوئے ۔ یہ تمام کاروائیاں کم ازکم دو صدیوں پر محیط ہیں ۔ ان کے تاریخی پس منظر کی دبیز تہوں کو جب تک نہ کھولا جائے آپ کے سامنے تخلیق پاکستان کے سارے عوامل سامنے نہیں آسکتے ۔

ہندوؤں کے روپ بہروپ :-

ہماری موجودہ نسل کا چونکہ ہندوؤں سے واسطہ نہیں پڑا ، اس لئے ان کو ہندوؤں کے روپ بہروپ کے بارے میں اور ان کی ذہنیت کے متعلق کماحقہ واقفیت نہیں ہے ۔ کسی غیر ملک میں جب ان کو ہندو کہیں مل جاتے ہیں تو بہت محبت جتاتے ہیں ، اور بعض اوقات یہ کہہ بھی دیتے

ہیں کہ تقسیم ہند کی لکیر نفرت کی لکیر ہے ۔ جس میں ہمارے بڑوں نے ہمیں رنگ کر دیا تھا وگرنہ پاکستان وہند کی ثقافت ایک ہی تو ہے ۔ ہماری نسل نو اچھی طرح سمجھ لے کہ آج سے سو سال قبل جتنی ہندو مسلمان سے نفرت کرتا تھا ۔ آج بھی ہندو مسلمان سے سو فیصد ہی نفرت کرتا ہے ۔ چونکہ نئی نسل کو ان سے سابقہ نہیں پڑا اس لئے ممکن ہے کہ وہ ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر ان کی ملنساری کے اطوار ، خلوص ، ہمدردی ، میل جول سے اس واہمہ میں پھنس جائیں کہ یہ سچ کہتے ہیں ۔ مگر ایک پرانی روایت " بغل میں چھری منہ میں رام رام " کے مصداق کئی سادہ لوح نوجوان مسلمان ان کے دام تزویر میں پھنس گئے اور سوچنے لگے کہ کیا واقعی ہمارے بڑوں نے ان سے علیحدگی اختیار کر کے غلطی کی تھی ۔

ہندوؤں سے بھلا پوچھئیے ! پاکستان کے مسلمانوں کو آپ ایسی باتوں سے دام فریب میں مبتلا کر کے راہ و رسم بڑھانے کے لئے سوچتے ہیں ۔ عرب ممالک میں بھی یہی وضاحت کی جاتی ہے ۔ یہی تاثر دیا جاتا ہے کہ ہندو کو دیکھئیے مسلمانوں کے ساتھ رہن سہن ، معاملات میں قطعاً تعصب نہیں برتتے ۔ مگر ایسا کیوں ہے ، کہ کروڑوں مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہیں ، ذلت وافلاس کی زندگی گزار رہے ہیں ۔ ملازم اور تاجر پیشہ افراد کیلئے ہر قسم کے دروازے بند ہیں ؟ آپ یہ محبت اور خلوص جو یہاں بیرون ملک جتاتے ہیں اپنے ملک ہندوستان میں کیوں نہیں دکھاتے ؟ اور کیوں برابری کا سلوک نہیں کرتے ؟ ہر سال ہندوستان کے کونے کونے میں سری نگر سے لیکر پانڈیچری تک مسلم کش فسادات کیوں برپا رہتے ہیں ؟ جن میں ہزاروں بے گناہ مسلمان مرد ، عورتیں اور بچے قتل کر دیئے جاتے ہیں ۔ آج بھی بھارتی مسلمان جس زبوں حالی کا شکار ہے دیکھ کر رونا آجاتا ہے ۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم افریقہ ، بوسنیا ، فسلطین میں ہونے والے مظالم کے خلاف تو آواز اٹھاتے ہیں مگر بھارت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتے ۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوؤں کی یہ دورنگی تصویر ہم وضاحت سے اپنی نئی نسل کو پیش کریں تاکہ ان کو معلوم ہوجائے کہ شعائر اسلامی کی پائمالی ہی ہندوؤں کی اول اور آخری ترجیح تھی ۔ جو دو سو سال پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے ۔

ہندوؤں سے علیحدگی کی ضرورت :-

ہندوؤں کے اصل روپ بہروپ کی تصویر کلیتاً چند سطروں میں ہم کھینچنے سے قاصر ہیں ، ان کے لئے تو تحریروں کے دفتر درکار ہیں ۔ آجکل کی نسل اس سے واقف نہیں کہ وہ کیا حالات

تھے جن کی وجوہات کے سبب ان کے بزرگوں نے ہندوں سے الگ ہوجانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ چونکہ نئی نسل کے لوگ ہندوؤں کی منکسرانہ ذہنیت وتربیت محبت اور منافقانہ چالوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اور ان کے خام ذہن ایسی باتوں کا جلد اثر قبول کرلیتے ہیں، کیونکہ ان کو ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دراصل ایسے مضامین ہمارے بچوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہونے چاہئیں۔ جن سے بچوں اور نوجوانوں کو شرح صدر ہوسکے۔ کہ ہمارے اسلاف نے قطعاً کوئی غلطی نہیں کی تھی، انکو معلوم نہیں کہ ہندو مسلمان کو کس قدر ناپاک سمجھتا ہے، اور مسلمانوں کو صرف چھو جانے سے ان کا دھرم بھرشٹ (دین خراب) ہوجاتا ہے۔ اور ان پر فوری طور پر اشنان (غسل) واجب ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو کسی بھی غیر ہندو کا وجود برداشت کرنے کارووادار نہیں تھا اور نہ ہے۔ وہ برابری کی سطح پر مسلمان کو زندگی گزارنے کا حق دینے کا سخت مخالف تھا۔ اس لئے ہندوں کے ساتھ بقائے باہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے تو مسلمانوں کو نجس اور ناپاک قوم کی حیثیت سے زیادہ کبھی حیثیت نہیں دی۔

دونوں قوموں کے نظریات میں اختلافات :-

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں مسلمان اور ہندو آباد تھیں، اور دونوں قومیں ھزار سال کے لگ بھگ ایک ہی ساتھ رہ رہیں تھیں، چھ سو سالہ مغل حکومت کے دوران چند بادشاہوں کو چھوڑ کر سب نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ گو ہمیں ان عوامل سے ذرہ بھر بھی اتفاق نہیں ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی اچھا کام کیا تھا۔ کیونکہ اسطرح ہندوؤں کے رسم ورواج، ثقافت وتہذیب کو بڑا عروج حاصل ہوا جو کہ اسلامی طرز معاشرت پر ایک بڑی ضرب تھی۔ مگر دیکھ لیجئے ان سب باتوں کے باوجود ہندو قوم نے ہمیشہ مسلمان کو ملیچھ (گندی ذات) کہہ کر پکارا، اور کہیں سمجھوتے کے آثار نمودار نہ ہوسکے۔ اسکی بڑی وجہ مذہبی تضاد تھا۔ ایک قوم جس جانور یعنی گائے کی پرستش (عبادت) کرتی ہے۔ اس کے پیشاب کو بچے کی گھٹی میں ملاکر بوقت پیدائش پلاتی ہے۔ جس کا گوبر متبرک سمجھا جاتا ہے۔ وہی گائے مسلمانوں کے لئے خوراک گوشت کا منبع ہے۔ ان کے اعتقاد کے مطابق مسلمان ایک ناپاک قوم ہے۔ اسٹیشنوں پر ہندو پانی الگ رکھا جاتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں کوئی ہندو لڑکا مسلمان کی سبیل سے پانی نہیں پیتا۔ کیونکہ مسلمان ان کی نظر میں ناپاک ہوتے ہیں۔ ہندو لڑکا اگر کبھی غلطی سے کسی مسلمان کے برتن میں کھاپی لیتا ہے تو اس پر غسل واجب ہوجاتا ہے اور فوری کپڑے تبدیل کرنے ضروری ہو

جاتے ہیں ۔ پھر آپ تصور کیجئیے کہ ان حالات میں مسلمان ہندوں کے ساتھ کسطرح گزارا کر سکتا تھا۔ ہندو کا ایک طرف تو رویہ اور سلوک مسلمانوں کے ساتھ انتہائی حقارت آمیز تھا، مسلمانوں کو ناپاک قوم سمجھتے تھے، شعائر اسلام کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے تھے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی، اور دوسری طرف یہ لوگ مسلمانوں کو ناپاک قوم سمجھتے اور اکھنڈ بھارت کے نعرے لگاتے۔

نظریہ پاکستان کی ابتداء کیسے ہوئی :-

انگریزوں نے جب ہندوستان پر تسلط حاصل کرلیا تو یہاں اپنی ثقافت کی جذب وترویج شروع کردی ہندو ثقافت میں اپنی پختگی نہ تھی، نہ ان کی عورتیں پردہ کرتی تھیں، نہ سوسائٹی کے میل جول کو برا سمجھتی تھیں، کیونکہ ان کے مذہبی شعائر میں اس کی پابندی نہ تھی۔ مسلمان مرد اپنی عورتوں کو ایسے اجتماعات میں لے جانا اور دیگر ثقافتی پروگراموں میں شمولیت دینی شعائر کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان حالات میں ہندو قوم فرنگیوں سے درپردہ قریب ہوتی چلی گئی۔ اس کے علاوہ ہندوؤں نے فرنگیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جسمیں وہ سو فیصد کامیاب ہوگئے کہ مسلمان دونوں (ہندو اور فرنگی) کا واحد دشمن ہے۔ چونکہ اسکا (مسلمان) مذہب غیر مسلم کو کافر کہتا ہے، لہذا مسلمان اور کافر کا سمجھوتہ کیسا ؟ فرنگی نے ان حالات میں انکو دور سے دور تر کرنے کی کوشش شروع کردی۔ منفرد اسلامی ثقافت کا تصور جو ازل سے مسلمانوں کے دل میں جاگزیں تھا وہ ہی دراصل ایک الگ سرزمین کے حاصل کرنے کا سبب بن گیا۔

انگریزوں نے دراصل اٹھارویں صدی کے اوائل میں تاجروں کی صورت میں آہستہ آہستہ برصغیر میں آمد شروع کردی تھی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درپردہ یہاں اقتدار حاصل کرلیا۔ مسلمان حکمران اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہوگئے۔ انگریزوں نے ان کی کمزوریوں، افتراق اور خانہ جنگیوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ہندوؤں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور آخر کار مسلمانوں سے اقتدار چھین لیا۔ مسلمان اسلامی شعائر میں اتنے کمزور ہوچکے تھے کہ بس نام کے مسلمان رہ گئے تھے۔ وگرنہ اندر سے کھوکھلے تھے۔

انگریزوں نے حکومت حاصل کرنے کے بعد ہندوؤں کو ہر قسم کی مراعات دیں۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کی سیاسی جماعت کانگرس کی بنیاد ہی انگریزوں نے رکھی۔ اس کانگریس کے ذریعے مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے انگریزوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی پرورش کی اور تھپکیاں،

ودلاسے دلاکر ایک نیا مذہب اسلام کے مقابلے میں کھڑا کرنا انگریزوں ہی کا کارنامہ تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوؤں کی جانب سے تقسیم بنگال کی جس انداز میں مخالفت کی گئی اس نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگادیا۔ پھر جب انگریزوں نے ہندوؤں کے مطالبے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو مسلمانوں کا انگریز حکومت پر سے مکمل اعتماد اٹھ گیا۔ اس طرح مسلمانوں نے اپنی ایک الگ اسلامی تنظیم مسلم لیگ قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مسلم لیگ نے جب لکھنوٴ پیکٹ کے ذریعے کانگریس سے مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ کیا اور جس طرح تحریک خلافت کے دوران ہندوؤں نے مسلمانوں کو دھوکہ دیکر سازشیں کیں ان سے مسلمانوں کو بہت دھچکا پہنچا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے خلاف شدھی سنگھٹن تحریک نے ہندوؤں کی مسلم کش ذہنیت کی کھلی کھول کر عکاسی کردی۔ نہرو رپورٹ کی تجاویز اور گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کے رویہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور اسکے بعد رہی سہی کسر 39-1937ء کے دوران بننے والی وزارتوں نے پوری کردی۔ اب مسلمان سمجھنے لگے کہ اگر انگریز چلے گئے اور اس ملک کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ آگئی تووہ تمام عمر غلام بن کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کی بہتری کی خاطر ان کے لیے ایک اسلامی ریاست یا اسلامی مملکت کا قیام ضروری سمجھا۔

اسلامی مملکت کیلئے قربانیاں:۔

ایک اسلامی مملکت کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے جن حالات میں نظریہ قائم کیا تھا وہ ہی نظریہ پاکستان تھا۔ یہ وہ تصور تھا جسکی بنیاد پر ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ سب اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تھا۔ جو مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت تھی کہ مسلمانان ہند نے ہندوؤں اور نگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو فعال تحریک چلائی اس کا بنیادی مقصد صرف اور صرف ایک ایسی اسلامی، فلاحی مملکت کا قیام تھا جو شریعت الہیٰ اور شریعت محمدیؐ کے تابع ہوگی۔ جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوگا ایسی تحریک کے دوران جو ظلم وستم انگریزوں اور ہندوؤں نے کئے ان تشدد آمیز، خونچکاں داستانوں کو دائرہ تحریر میں کہاں تلک لایا جائے۔ برصغیر میں تقریباً بیس لاکھ مسلمان مرد عورتیں اور بچے گولیوں، برچھیوں اور بھالوں سے خون میں نہلائے گئے۔ ہزاروں مسلمان عورتیں اپنا دامن عصمت بچانے کے لئے کنوؤں، تالابوں اور دریاؤں میں کود کر شہید

ہوگئیں ۔ امرتسر، لدھیانہ، پٹیالہ، فیروز پور سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں روانہ ہوئیں ۔ جو کبھی پاکستان نہ پہنچ سکیں ۔

اکھنڈ بھارت کے خواہاں جب مسلمانوں کے درپۓ آزار ہوگئے تب پاکستان کی تحریک نے جو راہ دکھائی اور سمت متعین کی وہ صرف اور صرف " لاالہ الاالله " ہی تھی ۔ اسی مملکت کے قیام میں ہماری زیست کا پیغام مضمر تھا ۔ اسی پر قوم کے وجود وبقاء کا انحصار تھا ۔ یہی اسلام کی طرز زندگی گزارنے کا واحد راستہ تھا ۔ یہ نظریہ کسی سیاسی، معاشی پروگرام کے تحت نہیں بنایا گیا تھا ۔ بلکہ صرف مسلمانوں کے عقائد کو مربوط کرکے وحدت کی شکل میں معرض وجود میں لانا تھا ۔ جو بفضل ربی معرض وجود میں آگیا ۔

نظریہ پاکستان درحقیقت ہمیں خدائے وحدہ لاشریک کی اطاعت اور اسکے خاتم النبین سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا درس دیتا ہے ۔ تاریخ گواہ ہے جب بھی مسلمانوں نے اس نظریہ کی تحت گذشتہ چودہ سو سالوں میں اپنے لئے راہ صواب نکالنے کی سعی کی، کامیابیوں نے ان کے قدم چومے اور مسلمانوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی باطل قوت سے ٹکڑا کر اسے پاش پاش کردیا ۔ اسی واطیعوا اللہ اور واطیعوا الرسول سے منسلک ہوکر اسی نظریہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ اور اسی نظریئے پر انشاء اللہ قائم رہے گی ۔ قومی نظریہ اور نظام اسلام ہماری زندگی میں لازم وملزوم ہیں ۔ اسی نظریہ کے تحت ہمارے قومی تشخص اور وجود کی پہچان ہے ۔ اور یہی نظریہ ہمارے قومی اتحاد کی علامت ہے ۔ مسلمانان ہند نے برصغیر میں آزاد اسلامی مملکت کا مطالبہ اسی لئے کیا تھا کہ خدائی آئین بموجب قرآن ہم زندگی بسر کریں ۔ یعنی پاکستان کا مطلب کیا:

" لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ "

بقیہ صـ۲۳

عروس خلافت اسلامیہ سے ہمکنار ہوچکے ہوتے تو ساری قربانیاں اس راہ میں ہیچ ہوتیں ۔ مگر آج تو " اندیشے " حقیقت بنکر ہمارا منہ چڑھا رہے ہیں اور

اندیشہ بھی جس بات کا اندیشہ جاں تھا آنکھوں سے اب اس حال کو میں دیکھ رہا ہوں

" سقوط مشرقی پاکستان " کا یہ داھئیہ کبریٰ اگر کسی طالب العلم کی متجسسانہ اور بے چین طبیعت کو مداوائے زخم جگر کی تلاش میں ان قصہ ہائے پارینہ کی طرف لے گئی تو اس " جرات گستاخانہ " کو قابل عفو سمجھ لیا جائے اور اس لیے کہ

بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری (کراچی)

نظریۂ پاکستان اور بانئ پاکستان

چند غور طلب مسائل

.... آپ یہ مقالہ پڑھ کر سوچ میں پڑ جائیں گے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ تاریخ یہی ہے بالفرض اگر کوئی حوالہ غلط ہے یا کوئی جملہ خلاف تہذیب ہو تو اسے نکال دیں۔ اس سلسلے میں دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ رواداری بہت اچھی چیز ہے۔ ہماری تہذیب و معاشرت کا حسن ہے لیکن تاریخ اور مذہب میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ اگر اسے جگہ دیدینگے تو تاریخ تاریخ رہیگی، نہ مذہب مذہب رہے گا۔ مذہب اور تاریخ میں روادار وقت کا سب سے بڑا اور خطرناک منافق ہوگا نہ کہ مؤرخ اور دیندار۔ اب چھاپنا نہ چھاپنا آپکا کام ہے۔ ہاں! اگر آپ اس سے متفق نہ ہو تو اس کے رد میں کوئی نوٹ یا تنقیدی حواشی اس پر لکھنے کا آپ کو پورا اختیار ہے۔ بلکہ اس سے مجھے خوشی ہوگی اور میں اپنی کتاب میں بھی اسے شامل کرلونگا۔　　(ابو سلمان)

نظریہ پاکستان ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ نظریہ پاکستان کوئی چیز نہیں۔ ہاں! یہ بحث ضرور ہے کہ نظریہ پاکستان کیا ہے؟ یا تاریخ و تحریک پاکستان کے تناظر میں نظریہ کیا ہونا چاہیئے؟ نیز یہ کہ اس فیصلے کی بنیاد کیا ہو؟ قائداعظم محمد علی جناح کے افکار؟ جو تحریک پاکستان کے رہنما اور اس کے بانی بھی تھے یا دوسرے تیسرے درجے کے کسی لیگی رہنما کا بیان یا تحریک کے مخالف کسی بزرگ مثلاً مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے ارشادات؟

یہاں مسئلہ افکار و نظریات کی صحت یا عدم صحت کا نہیں، صرف استحقاق کا ہے۔ یہ استحقاق کس کو حاصل ہے کہ اس کے افکار کو نظریہ پاکستان کی بنیاد بنایا جائے، تحریک پاکستان کے مخالف کسی بزرگ کو یا تحریک کے بانی سیکولر جناح کو؟ جو شخص کسی مقدس بزرگ کے پیچھے نماز

کے جواز کا قائل نہ ہو، اسے ان کے کسی سیاسی نظریے پر ایمان لانے کیلئے کیوں کر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بانی پاکستان کو سیکولر ماننے کے باوجود پاکستان تحریک میں ان کی رہنمائی، ان کے افکار کی اہمیت اور پاکستان کے قیام میں ان کی خدمات سے کوئی شخص کیسے انکار کرسکتا ہے؟ اس سلسلے میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کا جواب تلاش کیا جائے۔

کیا نظریہ پاکستان کی کوئی حقیقت ہے؟:-

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا نظریہ پاکستان نامی کوئی چیز ہے؟

دنیا کا کوئی شخص کسی راہ میں قدم اٹھاتا ہے تو اس کی کوئی منزل تو ضرور ہوتی ہے۔ کوئی عمل وقوع میں آئے، اس کا کوئی مقصد تو ضرور ہوتا ہے۔ نہ منزل کے تصور کے بغیر سفر کیا جاسکتا ہے نہ مقصد کے تعین کے بغیر کوئی عمل وقوع میں آتا ہے۔ درحقیقت یہ منزل کا تصور اور عمل کا مقصد ہی وہ نظریہ ہوتا ہے جو سفر و عمل میں اقدام و سعی کے لیے جوش وولولہ پیدا کرتا ہے۔ سفر وعمل میں کامیابی اسے مسرت سے ہمکنار کرتی ہے اور نظریے کے عملاً اطلاق ونفاذ سے اسے آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ کیا کوئی شخص اس بات کا یقین کرسکتا ہے کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں جو قافلہ، سیاست رواں ہوا تھا اس کی کوئی منزل نہ تھی؟ اور جس سیاسی عمل کا آغاز ہوا تھا اس کے مقصد سے رہنماؤں کے ذہن ناآشنا تھے؟ مقصد کی صحت پر کلام کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آغاز سفر میں منزل کا تصور ذہنوں میں بہت واضح نہ ہو، یہ ممکن ہے کہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کیلئے زیادہ سے زیادہ حقوق کے حصول کے لیے ایک دباؤ کے طور پر کیا گیا ہو، جیسا کہ کابینہ مشن پلان کو منظور کرلینے کے فیصلے سے ظاہر ہوا۔ لیکن یہ بات ناقابل یقین ہے کہ تحریک پاکستان کے بانیوں کے ذہن سفر کی منزل اور عمل وسعی کے مقصد سے محض ناآشنا تھے! بس ان حضرات کے سامنے جو مقصد تھا وہی ان کا نظریہ تھا اور وہی نظریہ پاکستان تھا۔

نظریہ پاکستان کیا تھا؟:-

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ نظریہ کیا تھا؟

پاکستان کی جنگ مسلم لیگ نے مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں لڑی تھی، وہ اس زمانے میں بلاشرکت غیرے اس کے مطلق العنان قائد بلکہ قائداعظم رہے تھے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کا نظریہ بھی مسلم لیگ کی تاریخ، مساعی وجدوجہد اور اسکے قائد کے افکار میں تلاش کرنا چاہیئے۔

۱. ہندوستان میں غیرفرقہ وارانہ کل ملکی سطح کی دو قومی جماعتیں تھیں:

(الف) آل انڈیا کانگریس کمیٹی (ب) آل انڈیا مسلم لیگ

سوشلسٹ، کمیونسٹ پارٹیاں وغیرہ بھی غیرفرقہ وارانہ ضرور تھیں، لیکن ان کی وہ حیثیت نہ تھی جو کانگریس اور مسلم لیگ کی تھی۔ جس طرح کانگریس میں اس کے مقاصد میں اتفاق رکھنے والے مختلف اقوام ومذاہب کے لوگ شامل تھے، مسلم لیگ بھی صرف ایک مذہب کے ماننے والی مسلمانوں یا شیعوں پر مشتمل نہ تھی بلکہ مسلم لیگ کے کریڈ سے اتفاق رکھنے والی اسماعیلی، آغاخانی، ذکری اورقادیانی بھی اس میں شامل تھے، جن کے بارے میں مسلمان مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ وہ خواہ کچھ ہوں، مسلمان نہیں۔ مسلم لیگ نام کی مسلمان اور حقیقت میں سیکولرجماعت تھی اور نام نہاد اسلامی سیاست کے اس پرجوش دور میں بھی جب اس کے لیڈر قرآن سرپر اٹھائے پورے برصغیر میں مضطربانہ گردش میں تھے اور ایک رقاصہ کی طرح نہ صرف ان کے قدموں کو بلکہ جسم کے کسی عضو کو قرارنہ تھا، وہ صرف ایک سیکولر جماعت تھی۔ مسلم لیگ نے بلاشبہ ایک خاص انداز سے سیاست میں حصہ لیا اور تقسیم ملک سے قبل اس کے اندازسیاست میں مسلم فرقہ واریت کا عنصر بہت نمایاں ہوگیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جماعت کبھی نہیں رہی۔ اس کے سامنے اس وقت بھی مسئلہ یہی تھا کہ ہندوستان میں سب سے بڑا مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ اسے اس طرح حل ہونا چاہئیے کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ہندوستان میں بسنے والی دوبڑی قوموں میں اسے بانٹ دیا جائے۔ اس کے بغیر ملک نہ آزادی سے ہمکنار ہوسکتا ہے نہ امن وسکون سے اور نہ ملک کی تعمیر وترقی اور عوام کی فلاح وبہبود کے کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ ابتداً اس نقطہ نظر سے کانگریس اور قومی وانقلابی انداز فکر رکھنے والی ہندوؤں اور مسلمانوں کی جماعتیں متفق نہ تھیں، لیکن آخر کار اس حقیقت کو سب نے تسلیم کرلیا اور ملک تقسیم ہوگیا۔

۲۔ مسلم لیگ نے کبھی مسلمانوں کی ترجمانی یا صرف انہیں کا مقدمہ لڑنے تک اپنی کوششوں کو محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کی تاریخ میں اس کے اجلاسوں کی پچاسوں قراردادیں اور اسکے صدور بالخصوص مسٹر محمد علی جناح کے خطبات صدارت کے سینکڑوں حوالے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جن میں انہوں نے ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کے حقوق کی نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ مسلمانوں کے معاملات ہی کی طرح ان کے لیے احتجاج کیا ہے اور ان کے مطالبات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے حقوق کے تحفظات کی جنگ لڑی ہے اور جب اس کی کوششوں نے منظم شکل اختیار کی اور کشتی ساحل مراد کو پہنچی تو اس نے ازخود اقلیتوں کے نمائندوں کو اقتدار میں شریک کرکے

ثابت کردیا کہ مسلم لیگ کی سیاست اسلامی سیاست سے مختلف اور بلاامتیاز مذہب و ملت ملک میں بسنے والی تمام اقوام وملل کی رہنمائی تک وسیع ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ
(الف): مسلم لیگی قیادت نے اپنے پلیٹ فارم سے ہمیشہ ہندوستان کی اقلیتوں کے مفادات کی جنگ لڑی اور (ب): مسلم لیگ نام کی مسلمان جماعت تھی۔ کبھی کبھی اس نے اس نام سے فائدہ بھی اٹھایا اور مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ لیکن اس کی تاریخ میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ اس کے کانگریس اور ملک کی دوسری سیاسی و مذہبی جماعتوں سے اتفاق واختلاف کے دائرے ماورائے عقیدہ ومذہب بنے اور ٹوٹے۔ (ج): جب ۱۹۴۶ء میں عارضی حکومت قائم ہوئی اور ابتداً انکار کے بعد جب اس نے حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو اپنی پانچ مسلم سیٹوں میں سے دو سیٹیں ایک چندریگر آغاخانی کو اور ایک منڈل غیر مسلم اچھوت رہنما کو دے دیں اور اس سلسلے میں اپنے اور بیگانوں کے طعن و تشنیع کی کوئی پروانہ کی۔ (د): قیام پاکستان کے بعد جب اگست ۱۹۴۷ء میں مملکت اسلامیہ پاکستان کی پہلی کابینہ وجود میں آئی تو اس دائرے کو مزید وسیع کرکے اس میں قادیانی وزیرخارجہ مقرر کرکے بتادیا کہ مسلم لیگ پاکستان میں سیاست کی بنیاد اسلامی افکار پر نہیں، سیکولر اصول پر رکھنا چاہتی ہے۔ (ہ): مسلم لیگ کی تاریخ کی اس خصوصیت کو نظرانداز نہ کردینا چاہئیے کہ اس نے اپنی تاریخ کے ایک خاص مرحلے میں علماء ومشائخ کو آگے بڑھایا، مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا اور ان کی بدولت ہندوستان کے انتخابات میں ایک ایسی کامیابی حاصل کی جو انتخابات کی تاریخ میں شاید اپنی مثال آپ ہو۔ لیکن اس نے کسی عالم دین کو مسلم لیگ کے معاملات سیاست میں دخیل ہونے کی اجازت کبھی نہ دی۔ انہیں استعمال کیا، ان سے کام لیا، لیکن مسلم لیگ میں ان کی جگہ اور حیثیت ہرگز نہ بننے دی۔ بعض علماء وقت کو خطوط لکھنے اور مشورے دینے سے زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا۔ بعض کارخ کسی جماعت کے قیام کی طرف موڑ دیا اور کسی کو فتویٰ ومضمون نویسی کے کام پر لگادیا۔ کسی کو لیگ کے جلسوں میں پرجوش تقریریں کرنے اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات بھڑکانے پرلگایا۔ کسی کو محض نامہ بری پر مامور کیا۔ کچھ علماء اپنے جبوں، کلف دارٹوپیوں اور عماموں کے ساتھ مسلم لیگ کے جشن سیاست میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، لیکن اتنی جرات ان میں سے کسی میں نہ تھی کہ وقت بے وقت خلوت کدہ، قائد پر بے تکلف دستک دے اور جھانک کر کہہ سکے " وصال یار کے امیدوار ہم بھی ہیں!"

ایک عالم صاحب ، جن کے بانی پاکستان سے قرب و تعلق اور اعتماد واخلاص کے چرچے رہے ، ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ جب انہیں بتایا گیا کہ " حضرت ! جناح صاحب کی میت کے ابتدائی رسوم تغسیل وتکفین اور نماز جنازہ تو ایک خاص عقیدے کے مطابق انجام دے کر جنازہ مسلمانوں کے حوالے کردیا گیا تھا ۔ تو بولے ، اچھا ! تو بعض حضرات ٹھیک ہی کہتے تھے ۔

یہ جو کچھ عرض کیا مسلم لیگ کے سیاسی کردار کے بارے میں ہیں ۔ اسکی رہنماؤں کے اشواق ومشاغل کا تو عالم ہی دوسرا ہے ۔ انکے حالات درون پردہ اور مشاغل شبینہ کا تو پوچھنا ہی کیا ۔ اگر چہ ان رہنماؤں نے اپنی زندگی پر کبھی پردہ نہ ڈالا تھا ۔ لیکن ہمارے بعض سادہ دل لوگ منع کرتے ہیں ۔ کہ کسی کے حالات کی کرید نہ کرنی چاہیئے ۔ حالانکہ بات حالات کے کرید ہی کی نہ تھی ۔ آنکھیں بند کرلینے کی تھی ۔ جن کے شباب وشراب کے شوق اور کلبوں کی زندگی اور جن بیگمات کے مشاغل ، تذکرے اخباروں کی زینت بنتے رہے ہوں ان کا معاملہ کریدنے اور تاک جھانک کا کہاں ہوتا ہے !

بانی پاکستان کا انداز فکر :۔

رہا بانی پاکستان کا معاملہ ۔ تو یہ بات نظر انداز نہ کردینی چاہئے کہ وہ مذہبی شخصیت نہیں تھے انہوں نے خود اس سے انکار کیا تھا کہ انہیں مسلمانوں کا مذہبی رہنما سمجھا جائے ۔ اور انکے لئے ایسے القاب وآداب استعمال کیئے جائیں جو مذہبی شخصیات کے شایان شان ہوں ۔ وہ ایک سیکولر ذہن کی شخصیت ، سیاستدان اور محض ایک وکیل تھے ۔ ان کے عادات واطوار ، زندگی کے اعمال ، روزوشب کے معمولات کا مذہبی رنگ ہی نہ تھا ۔ انہوں نے مذہبی نقطہ نظر سے کبھی سوچا ہی نہ تھا ۔ انکی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند تھی ۔ اس میں کوئی راز نہ تھا ، چنانچہ انکی زندگی کے مختلف ادوار میں بعض چیزیں بہت نمایاں تھیں ۔ مثلاً

(ا) قانونی اور دستوری مسائل میں ان کا ذہن مذہبی اور دینی اپروچ سے قطعی آزاد تھا ۔ چنانچہ بین المذاہب رشتہ ازدواج (سول میرج ۱۳ ۔ ۱۹۱۲) بچپن کی شادی (ساردا ایکٹ ۲۹ ۔ ۱۹۲۸ ء) شریعت بل (۱۹۳۷ ء) مسلم قاضی بل (۱۹۳۹ ء) وغیرہ پر مباحث میں جس آزاد خیالی کا اظہار انہوں نے کیا تھا وہ عام معاشرتی اور سماجی نقطہ نظر اور ان کے لادینی انداز فکر کا غماز تھا ۔ اسلام کے بعض معاشرتی احکام ومسائل کی بارے میں انکا یہ پختہ خیال تھا کہ قرآن کے احکام وقوانین چودہ سو سال پرانے ہیں ۔ جو موجودہ زمانے کے تقاضوں پر پورے نہیں اترتے ۔ وہ اپنے اس خیال میں راسخ تھے ، وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے نا آشنا بھی تھے ، اور بے پروا بھی ۔ اسلامی احکام

ومسائل سے انکی عدم واقفیت صاف ظاہر ہے۔ بعض علماء دین نے جو انکے ذوق ومزاج اور اشغال وعقائد سے واقف تھے۔ ان پر بے دینی اور فسق وکفر کے فتوے لگائے۔ (ملاحظہ ہو: مسلم لیگ کی زریں بخیہ گیری، احکام نوریہ، شرعیہ بر مسلم لیگ الجواب السنیہ علی زیہا۔ السوالات اللیگیہ۔ مسلم لیگی علماء کے فتوے، نیز دیوبندی، بریلوی علماء کے بعض اور رسائل وغیرہ۔

(۲) وہ اولاً متحدہ ہندوستانی قومیت کے قائل ومبلغ رہے اور ایک مختصر عرصے کے استثنا کے بعد ٹھیک متحدہ ہندوستانی قومیت کے اصول پر متحدہ پاکستانی قومیت کے قائل ہوگئے، اسی اصول کی بنا پر کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ہندوسانی قومیت کا حصہ ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کی تھی اور انہیں ہندوستان کے حوالے کر آئے تھے۔ یہی توقع انہوں نے پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں سے کی۔ بانی پاکستان کا قلب فرقہ وارانہ جذبات سے قطعاً خالی تھا۔ بلاشبہ مقدمہ پاکستان کے دوران میں انہوں نے مسلمانوں کے جوش اور اتحاد کو قائم رکھنے کیلئے بعض جذباتی باتیں کی تھیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ فرقہ پرست ہرگز نہیں تھے

تحریک پاکستان کی تاریخ اور پس منظر:-

تحریک پاکستان کی ایک تاریخ ہے۔ اس کا پس منظر تھا۔ اس تحریک میں مختلف محرکات کار فرما تھے۔ یہ تحریک کئی نشیب وفراز سے گزرکر کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ اب آئیے تحریک پاکستان کے پس منظر اور اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی خصوصیات پر نظر ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ یہ تحریک کس نوعیت کی تھی۔ اس تحریک کے بانی اور قائداعظم کے سامنے مذہبی، جمہوری، سیکولر یا کسی اور قسم کا کیا نظریہ تھا؟ نظریے کی جو نوعیت ان کی افکار سے ظاہر ہوئی وہ نظریہ پاکستان ثابت ہوجائے گی۔ ذیل میں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں جن سے اس امر کا بخوبی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ بانی پاکستان کا نظریہ پاکستان کیا تھا؟

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمارے سامنے سر محمد یامین خان کی ایک روایت آتی ہے جس سے تحریک کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یکم مارچ ۱۹۳۹ء: ڈاکٹر ضیاء الدین نے لنچ پر مجھ کو مسٹر جناح، سر ظفر اللہ خان اور سید محمد حسین بیرسٹر الہ آباد کو بلایا۔ میرے ایک طرف مسٹر جناح بیٹھے تھے اور دوسری طرف سر ظفر اللہ خان۔ مسٹر جناح کے دوسری طرف سید محمد حسین تھے اور سر ظفر اللہ خان کے دوسری

طرف ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد۔ لنچ کرتے میں سید محمد حسین نے چیخ چیخ کر جیسی ان کی عادت ہے کہنا شروع کیا کہ چودھری رحمت علی کی اسکیم کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ وبلوچستان ملا کر بقیہ ہندوستان سے علاحدہ کر دیے جائیں۔ ان سے پاکستان اسطرح بنتا ہے کہ پ سے پنجاب، الف سے افغان یعنی صوبہ سرحد، ک سے کشمیر، س سے سندھ، تان بلوچستان کے اخیر کا ہے۔ چونکہ سیدمحمد حسین زور زور سے بول رہے تھے، سر ظفر اللہ خان نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اس شخص کا حلق بڑا ہے مگر دماغ چھوٹا ہے۔ سرظفراللہ خان اسکی مخالفت کرتے رہے کہ یہ ناقابل عمل ہے مسٹر جناح دونوں کی تقریر غور سے سنتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے کہ اسکو ہم کیوں نہ اپنالیں اور اسکو مسلم لیگ کا کریڈ بنائیں۔ ابھی تک ہماری کوئی خاص مانگ نہیں ہے۔ اگر ہم اس کو اٹھائیں تو کانگریس سے مصالحت ہوسکے گی، ورنہ وہ نہیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ مغربی علاقے کے واسطے یہ کہہ رہے ہیں۔ مشرقی علاقے کا کیا ہوگا؟ مسٹر جناح نے ذرا غور کیا اور بولے کہ ہم دونوں طرف علاقوں کو علیحدہ کرنے کا سوال اٹھائیں گے۔ بغیر اسکے کانگریس قابو مین نہ آئے گی۔ میں نے کہا ابھی چند دن ہوئے بھائی پرمانند نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے جواب ٹھیک دیا تھا۔ اگر بارگیننگ یعنی سودے بازی کیلئے یہ مسلہ لیگ کا کریڈ یعنی اصولی مانگ بناکر اٹھایاجائےتو پھر ہٹنا مشکل ہوگا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ہم کانگریس کا ردعمل دیکھیں گےاس پر یہ معاملہ ختم ہوگیا، چونکہ یہ کھانے کی میز کی گفتگو تھی"۔ (نامہ اعمال، جلداول، لاہور۔ ۱۹۷۰ء (پہلی بار) ص ۲۶۔ ۲۵)

اس بیان سے چند باتیں بالکل واضح ہوکر سامنے آجاتی ہیں۔

(الف). اس وقت تک مسلم لیگ کی کوئی خاص مانگ نہیں تھی۔ (ب). یہ مسلم لیگ کی اصولی مانگ (کریڈ) نہیں تھی۔ (ج). یہ کانگریس سے بارگیننگ کا محض ایک ایشو تھا۔

(د). سر ظفر اللہ خان کے نزدیک یہ چھوٹے دماغ کی ایک ناقابل عمل بات تھی۔ (ہ). یہ سب کچھ کانگریس کو قابو میں کرنے کے لیے سوچا جارہا تھا۔ (و). اس میں اسلام کے مفاد کی کوئی بات نہ تھی اکھاڑے میں ایک مقابل پہلوان کو زیر کرنے کیلئے بطور ایک حربے اور داؤپیچ کے سوچاجارہا تھا۔

(ز). یہ خطرہ بھی ذہن میں موجود تھا کہ کہیں یہ مانگ گلے نہ پڑ جائے۔

(۲). ۱۹۴۰ءمیں ۳ فروری کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس (منعقدہ دہلی) میں جو سب کمیٹی پاکستان کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کی چیئرمین شپ میں بنائی گئی تھی، وہ بنائی ہی وائسرے کے ایما پر گئی تھی۔ اس میں لیگ کے سربرآوردہ اور پنجاب وبنگال کے

رہنماؤں کو استعمال کیا گیا تھا ۔ اور ان تینوں نے ۵ ۔ ۶ فروری کو وائسرائے کو اپنی ملاقاتوں میں کمیٹی کے قیام کی اطلاع دی تھی اور وائسرائے نے خوشی کے اظہار کے ساتھ کمیٹی کی کاروائی سے اسے باخبر رکھنے کی ہدایت کی تھی ۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے : ٹرانسفر آف پاور ۔ انتقال اقتدار کی دستاویزات از انڈیا آفس لائبریری (لندن) .بحوالہ " انتقال اقتدار اور پاکستان " از محمد فاروق قریشی (لاہور) ، حقائق حقائق ہیں از خان عبدالولی خان ، مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم ازپیر علی محمد راشدی) اس سے اسلام تو کجا مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ اور ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کی توقع بھی عبث تھی ۔

۳۔ پاکستان کی تاریخ میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء اور اس روز پاس ہونے والی قرارداد کو جو اہمیت حاصل ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں لیکن ،

(الف) : اس پوری قرارداد کو پڑھ جائیے ، اس میں پاکستان یا اسلام کا نام تک نہیں ۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ سیاسی مسئلے کے حل میں ایک تجویز ہے اور بس یہی حال صدر اجلاس کے خطبہ صدارت کا ہے ۔ (اس میں ایک جگہ " اسلام " کا لفظ آیا ہے لیکن اس کا محل دوسرا ہے) ۔

(ب) : مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی یہ قرارداد بہت جامع اور اہمیت کی حامل ہے ۔ اس میں تعصب اور فرقہ وارانہ جذبات سے متاثر ہوئے بغیر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل پیش کیا گیا ہے ۔ اس تجویز کی بنیاد ملک کی تقسیم ہی ہے ، لیکن اس کا فرقہ واریت سے کوئی تعلق نہیں ۔ اگر مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کے لیے حق حکمرانی طلب کیا گیا ہے تو یہی حق غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندوؤں کے لیے تجویز کیا گیا ہے ۔ جو حق مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے لیے مانگا تھا تو پہلے مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو دینے کا اعلان کر دیا تھا ۔

ج : قراردادِ لاہور میں ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل درست ہو یا نہ ہو لیکن یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قرارداد تعصب اور تنگ نظری سے ضرور پاک تھی ۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ کوئی دستوری منصوبہ بغیر اس صورت کے اس ملک میں قابل عمل یا قابل قبول نہیں ہوگا کہ اسے مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر وضع کیا جائے ۔

" یہ ایک جغرافیائی طور پر متصل سرحدوں کا از سرنو حد بندی ایسے منطقوں کی شکل میں کی جائے جو ملکی تقسیم میں ضروری ردوبدل کے بعد اس طرح ترکیب پائیں کہ جن رقبوں میں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے ، جیسے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں میں وہ گروہ بند

ہوکر ایسی آزاد مملکتیں بن جائیں کہ ان کے ترکیبی واحدے خود مختار اور مقتدر اعلیٰ ہوں ۔

مسلمانوں کو ہندوستان کے چار صوبوں (بنگال ، پنجاب ، سرحد اور سندھ) میں مجموعی طور پر عددی اکثریت حاصل تھی ۔ قرارداد میں چونکہ صوبے کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا ، بلکہ علاقے کا لفظ استعمال ہوا تھا ۔ بنگال اور پنجاب دوصوبوں میں ایسے علاقے (اضلاع اور تحصیلیں) بھی تھے جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور وہ علاقے مسلم اقلیت کے علاقوں (صوبوں) سے متصل بھی تھے ۔ اس صورتحال نے پنجاب وبنگال کی تقسیم کیلئے دروازہ کھول دیا اور قرارداد نے ہندوستان کے دیگر سات صوبوں میں حکومت کے قیام اور دستور سازی کے وہی حقوق وہاں کی اکثریت (ہندوؤں) کو عطا کردیے ۔ مذکورہ پیراگراف کے علاوہ قرارداد میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں یہ پیراگراف تھا :

" ان واحدوں اور منطقوں میں اقلیتوں کے مذہبی ، ثقافتی ، معاشرتی ، سیاسی ، انتظامی اور دوسرے حقوق ومفادات کی حفاظت کیلئے مناسب ، مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات کا بندوبست ان اقلیتوں کے مشورے سے معین طور پر دستور میں کیا جائے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، انکے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی ، ثقافتی ، معاشی ، سیاسی ، انتظامی اور دوسرے حقوق ومفادات کی حفاظت کیلئے مناسب ، مؤثر اورواجب التعمیل تحفظات انکے مشورے سے معین طور پر رکھے جائیں "۔(جدوجہد پاکستان ازاشتیاق حسین قریشی کراچی ۱۹۸۴ء (اول) صفحہ ۴۵۹)۔

بلاشبہ یہ قرارداد تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھی ، لیکن ایک ایسی قرارداد جس نے :

(۱) اول روز سے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے مطالبے کا جواز پیدا کردیا ہو ، ہندوستان کے چار صوبوں میں حکومت کرنے کے شوق میں دیگر سات صوبوں میں فرقہ پرستوں اوراحیائی ذہن رکھنے والوں کیلئے ایک خاص قسم کی حکومت قائم کرنے کا حق تسلیم کرلیا ہو اور چونکہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں چھوٹے چھوٹے دیہات تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کرلیا گیا ہو ، اسلیئے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا صحیح اور مدبرانہ حل بھی تھا ، یہ بات محل نظر ہے ۔ قرارداد کا ایک پہلو یہ تھا کہ چار صوبوں میں حکومت بنانے کے حق کا مطالبہ کوئی مطالبہ ہی نہ تھا ۔ اس لیے کہ وہاں مدت ہائے دراز سے مسلمانوں ہی کی حکومت بنتی چلی آرہی تھی اور وہ اپنے عوام کی فلاح وبہبود اور ترقی کے لیے دستور سازی کرنے اور اسکیمیں بنانے میں پہلے ہی آزاد اور خودمختار تھے ۔ (۲) اس مطالبے نے غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو بہت تھوڑی اور غیر مؤثر اقلیت میں تبدیل کردیا ۔ پہلے وہ اپنے صوبوں میں جن حقوق کے مالک تھے اب وہ

اکثریت کے دیے ہوئے تحفظات اور عطاو بخشش کے منت گزار ہوگئے تھے۔ (۳)۔ قرارداد میں آزادی کے بعد کے حالات میں ریاستوں کے لیے نازک پوزیشن اور سنگین حالات کے پیدا ہوجانے کے مسئلے کو قطعاً نظرانداز کردیا گیا تھا۔ رزولیوشن کی تائیدمیں تقریر کرتے ہوئے چودھری خلیق الزماں نے کہا تھا: "مجھ سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ مسلم اقلیتوں کا تقسیم کے بعد کیا حشر ہوگا؟ میں ان کو بتلانا چاہتاہوں کہ جو ہندواقلیتوں کا حشر مسلم صوبوں میں ہوگا وہی ہمارا ہندوصوبوں میں ہوگا۔" (شاہراہ پاکستان۔ کراچی۔ ۱۹۸۷ء طبع اول صفحہ ۷۹)۔ لیکن یہ تو مسئلے کا کوئی حل نہ ہوا کہ ایک جگہ غیر مسلم اقلیت کا جو حشر ہو، وہی دوسری جگہ مسلم اقلیت کا ہو۔ اس فیصلے کا تدبروسیاست سے کیا تعلق؟ چوہدری خلیق الزماں نے صاف لفظوں میں یہ خیال ظاہر کردیا ہے کہ نہ تو قرارداد کو قابلیت کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا اور نہ یہ فیصلہ ہی مدبرانہ تھا۔ یہ سوال کہ مسئلے کی واقعی نوعیت کیا تھی۔کیا تقسیم کی تجویز کوئی اسلامی تجویز تھی؟ کیا تجویز کا مقصد اسلامی مفادات کا تحفظ تھا؟ یا یہ ہندوستان کے ایک پیچیدہ سیاسی مسئلے کا سیاسی حل تھا؟ اس سلسلے میں اجلاس کی صدارتی تقریر بہترین دستاویز ہے، جسکی روشنی میں مسئلے کی نوعیت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ صدراجلاس مسٹر جناح نے فرمایا: "یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے (کسی ایک قوم کے) فرقوں کے درمیان نہیں، بلکہ نمایاں طور پر ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اس پر اسی حیثیت سے غور کرنا چاہیے۔ جبتک اس اساسی اور بنیادی حقیقت کا احساس نہیں ہوتا، اس وقت تک جو دستور بھی بنایا جائے گا وہ تباہی پر منتج ہوگا اور صرف مسلمانوں کیلئے نہیں بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں کیلئے بھی تباہ کن اور مضرت رساں ثابت ہوگا۔ اگر برطانوی حکومت حقیقتاً اس برعظیم کے باشندوں کیلئے امن اور خوشحالی کے حصول کی پرشوق ومخلصانہ خواہش رکھتی ہے تو ہم سب کیلئے صرف یہی ایک راستہ کھلا ہوا ہے کہ ہندوستان کو خودمختار قومی ریاستوں میں تقسیم کرکے بڑی قوموں کو جداگانہ وطن دے دیں، اسکی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ ریاستیں ایک دوسرے کی مخالف ہوں۔ ان کے برعکس ان کی رقابت اور کسی ایک کی یہ فطری خواہش اور کوشش کہ وہ معاشرتی نظام پر غلبہ حاصل کرے اور ملک کی حکومت میں دوسرے پر اپنی بالادستی قائم کردے، خود بہ خود غائب ہوجائے گی۔ اسکے نتیجے میں انکے درمیان بین الاقوامی معاہدات کے ذریعے مزید فطری خوش سگالی پیدا ہوگی اور وہ اپنے ہمسائیوں کے ساتھ مکمل ہم آہنگی سے رہ سکیں گے۔ مزید برآں اقلیتوں کے متعلق دوستانہ تصفیہ اور بھی زیادہ آسان ہوجائے گا۔ چونکہ مسلم ہندوستان اورہندو ہندوستان، جو مسلمانوں اور دوسری مختلف اقلیتوں کے حقوق ومفادات کی حفاظت زیادہ مناسب اور مؤثر طور پر کرسکیں گے۔ باہمی مراعات

کے اصول پر خاطر خواہ انتظامات اور فیصلے کرلیں گے ۔" (جدوجہد پاکستان از اشتیاق حسین قریشی، صفحہ ۶۱۔۴۲۰)
یہ بانی پاکستان کی تقریر کے ایک طویل و مکمل پیراگراف کا ترجمہ ہے جو مرحوم کے نہایت معتقد اور اسکالر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کیا ہے ۔ اس کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا نظریہ کیا تھا ؟ انگریزوں ، ہندوؤں ، مسلمانوں اور ہندوستان کی تمام اقلیتوں کا مفاد ، سب کی یکساں بھلائی کا خیال ، سب کے مفاد کے بقا اور تحفظ کا تصور ، فرقہ پرستی ، تنگ نظری اور تعصب سے کلیتاً دوری ، پوری تحریر کے دامن پر پاکستان اور اسلام کے نام کا دھبا بھی نہیں ۔
(ج) چوہدری رحمت علی کی بدولت ۱۹۳۲ء سے برصغیر ہندپاکستان کی فضا پاکستان کے نام سے نا آشنا نہ رہی تھی ۔ لیکن ایک مدت تک پاکستان کا تصور کسی رہنما کی حلق سے نیچے نہ اترا تھا ، جو حضرات وقت کی عملی سیاست میں حصہ لے رہے تھے ، وہ خاص طور پر پاکستان کا نام لینے میں محتاط تھے ۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی تاریخی قرارداد میں ، اس کی تائیدی تقاریر میں اور خطبۂ صدارت میں اس لفظ سے احتراز برتا گیا تھا ۔ بلکہ اس کے بعد بھی ایک مدت تک جو کئی برسوں پر محیط ہے ، قرارداد لاہور پر بحث و مباحثہ میں اس لفظ کے استعمال سے احتیاط برتی جاتی تھی ۔ شاید یہ خوف ہو کہ یہ انتہاپسندانہ لفظ گلے میں ہڈی بن کر نہ اٹک جائے ۔ بہرحال ذمہ دار رہنماؤں کا یہی حال تھا ، حتیٰ کہ پاکستان اور تحریک پاکستان کے بانی محترم نے بھی اس لفظ کے استعمال سے اپنی زبان کو نا آشنا رکھا تھا ۔ بقول مرحوم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : " ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی تو قائداعظم اسے قرارداد پاکستان کا نام نہیں دیتے تھے ۔ ہندو اخباروں نے اسے اس شدت اور تسلسل سے پاکستان کا نام دیا کہ قائداعظم کہنے لگے کہ اگر تم اسے پاکستان کا نام دینے پر اتنے ہی مصر ہو تو چلو ہم بھی اسے پاکستان کہیں گے ۔ یہاں سے پاکستان کا نام چل نکلا ۔"
(افکار و حوادث ، روزنامہ انجام ، کراچی ، ۱۳۔ مارچ ۱۹۶۷ء ، صفحہ ۸ ، ۱۸)
ڈاکٹر خورشید کے حوالے سے زیادہ اہم حوالہ لیگی رہنما اور قانون دان جسٹس ظہیر الحسنین لاری کا ہے ۔ انہوں نے ۲۲۔ مارچ ۱۹۴۰ء ہی کو جب قائداعظم نے سبجیکٹ کمیٹی میں قرارداد پیش کی تھی تو کئی ضابطے کے سوال اٹھائے تھے ۔ انہوں نے " نظریہ پاکستان کا پس منظر " میں قرارداد کے نقص پر بحث کی ہے ۔ پھر لکھتے ہیں : " دراصل قرارداد لاہور کو قرارداد پاکستان کہنا سراسر بہتان ہے ۔ کیونکہ قرارداد لاہور میں نہ صرف ایک آزاد مسلم مملکت کا ذکر نہ تھا اور نہ ہی پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا ، بلکہ اس میں سرے سے لفظ پاکستان ہی نہ آیا تھا یہ بہتان تراشی ہندوؤں کی تھی اور یہ ہندو

اخبار ہی تھے جنہوں نے لاہور قرارداد کو پاکستان قرارداد کہا۔ چنانچہ خود قائداعظم نے ۱۹۴۲ء دہلی میں مسلم لیگ کے جلسے میں اپنے صدارتی خطبے میں کہا: "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان کا لفظ ہم پر ہندو پریس نے تھوپا ہے اور یہ انہیں کا پیدا کردہ ہے۔ (نظریہ پاکستان کا پس منظر۔ صفحہ ۱۱)

جسٹس لاری مرحوم کا اشارہ مسلم لیگ کے اڑتیسویں۔ سالانہ اجلاس دہلی ۲۱ تا ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء میں قائداعظم کے خطبہ صدارت کی طرف ہے۔ (تفصیل کیلئے دیکھیے" فاؤنڈیشن آف پاکستان ۱۹۷۰ء جلد دوم، صفحہ ۴۲۵-۴۲۴) قائداعظم کے اس خطبۂ صدارت پر ایک فٹ نوٹ میں فاؤنڈیشن آف پاکستان کے مرتب نے لکھا ہے کہ سیشن کے آغاز سے پہلے مسلم لیگ کے کچھ لوگوں نے تجویز کیا تھا کہ مسلم لیگ کو اعلان کردینا چاہیئے کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد قرآن ہوگی۔ اس سلسلے میں بمبئی کے ڈاکٹر عبدالحمید قاضی نے ایک قرارداد کا مضمون بھی لیگی نمائندوں میں تقسیم کیا تھا کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد نظریہ حکومت الہیہ پر ہوگی۔ لیکن قائداعظم کے بیان کی روشنی میں انہوں نے یہ قرارداد پیش نہیں کی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۴۰)۔ کبھی کسی نے سوچا کہ پاکستان کا نام لینے میں اتنی احتیاط کیوں برتی جاتی تھی؟ شاید اس لیے کہ "پاکستان" کے لفظ سے "اسلامک اسٹیٹ" کی آئیڈیالوجی کا ایک بلند تصور وابستہ تھا، جب کہ مسلم لیگ کے رہنمایان کرام کے ذہن میں ایسا کوئی تصور نہ تھا۔ ان کے نزدیک صرف چند سیاسی مطالبات اور انتظامی حقوق منوانا، نئے دستور میں ان کے ذکر، ان کے تحفظات کی چند دفعات اور مسلم لیگ کی تاریخ میں اس کارنامے کا لکھ دیا جانا ہی گویا ہندوستان کے سب سے بڑے اور فرقہ وارانہ سیاسی مسئلے کا حل تھا۔

سیکولر اپروچ:۔

بانی پاکستان کی غیرفرقہ وارانہ اور سیکولر اپروچ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۴ء کے اجلاس لاہور میں مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم نے قادیانیوں کو ان کے اسلام سے خارج ہونے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کے اس سے اتفاق کی بنا پر مسلم لیگ سے نکالنے کا نوٹس دیا۔ سبجیکٹ کمیٹی کے ایجنڈے میں ان کی قرارداد کو درج کرلیا گیا لیکن قائداعظم نے اسے پیش کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس پر مولانا ظفرعلی خان مرحوم نے زمیندار میں کئی اداریے لکھے۔ واویلا کیا، لیکن ان کے احتجاج کو پرکاہ کی حیثیت بھی نہ دی گئی۔

کیا تقسیم کا مطالبہ اسلامی مطالبہ تھا؟

لیکن کیا یہ نظریہ یا مطالبہ کوئی مذہبی یا اسلامی مطالبہ تھا؟

(۱). اس مطالبے کی بنیاد تقسیم کے نظریے پر تھی اور اس نظریے کی تائید میں صرف مسلمان ہی نہ تھے بلکہ ہندو، عیسائی، پارسی اور دیگر کئی مذاہب کے ماننے والے تھے۔ اور ان کا تناسب ۳۶ / ۱۴۵ تھا۔ ظاہر ہے کہ جس نظریے میں ۲۵٪ فی صد غیر مسلموں نے اپنا مفاد تلاش کرلیا، ہو وہ اسلامی کیوں کر ہوسکتا ہے؟ (۲). پھر جن مسلمانوں نے تقسیم ملک کو مسئلے کا حل بتایا تھا، انہوں نے خود اسے اسلامی حل کب کہا تھا؟ ان کے نزدیک بھی ہندوستان کے مسئلے کا یہ ایک سیاسی حل تھا، نہ کہ اسلامی؟ (۳). جسطرح تائید کرنے والے مختلف مذاہب کی ماننے والے تھے۔ اسی طرح اس کی مخالفت کرنے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی ہندوستان کے سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔
لیگی رہنماؤں کے چند حوالے:۔

اس زمانے میں صدر مسلم لیگ اور لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے جو تقریریں کیں ان میں دو باتیں نمایاں ہیں: (۱). ان میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے اور اقلیتوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ اور ان کے حل کے مسائل کو انہوں نے ہر تقریر میں بہ دلائل ذکر کیا ہے۔
(۲): پاکستان میں نظام حکومت کے بارے میں انہوں نے صاف صاف اور بار بار اعلان کیا کہ مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یہاں بانی پاکستان اور لیگ کے چند دیگر رہنماؤں کی چند تقاریر وبیانات اور لیگ کے ترجمان بعض اخبارات کے اداریوں کے حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:
(الف): ڈان کے ایڈیٹر نے مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کے ایک بیان کی وضاحت میں ڈان دہلی کی اشاعت ۹۔ ستمبر (۱۹۴۵ء) میں ایک اداریہ لکھا ہے۔ اسمیں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں۔
"مسٹر جناح نے پاکستان کو ایک دنیاوی اسٹیٹ قرار دیا ہے اور ہمیشہ اس بات کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ کہ اس میں مسلمانوں کی حکومت الہیہ قائم ہوگی۔ وہ لوگ جو پاکستان کو پان اسلامزم (اتحاد اسلامی) کا مرادف قرار دیتے ہیں۔ اتحاد کے دشمن ہیں"۔ اس اداریے میں مسلم لیگ کے صدر کے جس بیان کی وضاحت کی گئی ہے وہ موصوف نے نیوز کرانیکل (بمبئی) کے نمائندے کو دیا تھا اور چند روز قبل ڈان (دہلی) ہی میں شائع ہوا تھا۔ بیان میں کہا گیا تھا:
" پاکستان کی حکومت یورپین جمہوریت کے طریقے پر ہوگی۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادی اور مردم شماری کی حیثیت سے رائے شماری کرکے فیصلہ صادر کریں گے۔ وزارتوں اور مجلس لیجروں میں سب حصہ دار ہوں گے۔ (اخبار زمزم، لاہور ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء)
(ب): ۲۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی میں طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا دستور اساسی کیا ہوگا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری اسٹیٹ اور اسکے دستور اساسی کی تشکیل ان علاقوں کے تمام باشندگان (مسلم، سکھ، ہندو، عیسائی وغیرہ) ایک مجلسہ منتخبہ کے توسط سے خود ہی کریں گے۔ (روزنامہ ڈان، دہلی ۲۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

ج: ۲ نومبر ۱۹۴۵ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن میاں بشیر احمد نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا! "ہمارے قائداعظم بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں بلالحاظ مذہب عوام کی حکومت ہوگی۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو برابری اور آزادی دی جائے گی"۔

(د): ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے بمبئی میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو ایک بیان دیا تھا۔ مسلم لیگ کے ترجمان ڈان نے اس بیان کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ مسٹر جناح نے کہا: "پاکستان سیاسی طور پر ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ ہندوؤں کی راہ میں کوئی معاشی رکاوٹ پیدا نہیں کی جائے گی۔ میں اس عقیدے کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان میں ایک جماعت (مسلمانوں) کی حکومت ہو۔ میں اس ایک جماعت کی مخالفت کروں گا جو تنہا حکومت کرے۔ پاکستان کی ہندو اقلیتوں کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ انکے حقوق کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ کیونکہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر کوئی مہذب حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی۔"

(روزنامہ "ڈان"۔ دہلی، ۱۰ نومبر ۱۹۴۵ء) اس بیان کا خلاصہ مسلم لیگ کے اردو ترجمان منشور (لکھنو) نے بھی اپنی ۱۱ نومبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ مسٹر جناح نے اس بیان میں یہ بھی فرمایا: "مجھے امید ہے کہ پاکستان کی بڑی صنعتیں اور کارخانے سوشلسٹ اصول پر قوم کے قبضے میں دے دیے جائیں گے۔

(ہ): لاہور کے لیگی اخبار روزنامہ "انقلاب" نے جس کے مدیر چوہدری غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک تھے، پاکستانی جمہوریت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مقالہ افتتاحیہ شائع کیا ہے۔ اس میں اخبار لکھتا ہے: "لیگ کی قرارداد میں یہ بالتصریح مذکور ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اس کے ہر حصے کی حکومت متعلقہ آبادیوں کی رائے اور مشورے سے بنے گی۔" اس کے آگے اخبار لکھتا ہے: "ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی، جو شخص ایسا خیال ظاہر کرتا ہے وہ لیگ کے مجوزہ پاکستان سے بالکل بے خبر ہے۔" ("انقلاب" لاہور، ۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء)

(و)۔ پاکستان میں نظام حکومت کے بارے میں قائداعظم کے خیالات کوئی راز نہیں ۔ انہوں نے ہمیشہ دوٹوک الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار اور کبھی انہیں چھپانے یا ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ۔ ۲۱ مئی ۱۹۴۷ء کو رائٹر کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے تقسیم ملک سے متوقع پیدا شدہ حالات کے بارے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ ٹرانسفر آف پاور میں ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۲ کے طور پر شامل ہے ۔ رائٹر کے نمائندے نے ان سے جو سوالات کیے ان میں سے بعض سوالات پاکستان میں اقلیتوں کی حیثیت اور پاکستانی حکومت کے نظام کے بارے میں تھے ۔ اس میں انہوں نے صاف طور پر کہا کہ پاکستان کی حکومت نمائندہ اور عوام کی منتخب ہوگی ۔ ان کے انٹرویو میں اس جملے کی پوری وضاحت موجود ہے ۔ انہوں نے فرمایا:

" پاکستان کے مرکزی اور اس میں شامل اکائیوں کے انتظام وانصرام کے فیصلے بلاشبہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کرے گی ، لیکن پاکستان کی حکومت صرف پاپولر ، نمائندہ اور جمہوری ہوگی ۔ اس کی کابینہ پارلیمنٹ کے سامنے اور دونوں آخر کار رائے دہندگان اور عام طور پر عوام کے سامنے جوابدہ ہوں گے ۔ اس ضمن میں ذات ، پات ، عقیدے یا فرقے کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا " ۔ ان سے ایک سوال پاکستان میں اقلیتوں کی حفاظت کے بارے میں کیا گیا ۔ انہوں نے جواب دیا:

" اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ اقلیتوں کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی ۔ اقلیتیں پاکستان کی شہری ہوں گی اور انہیں تمام حقوق حاصل ہوں گے ۔ انہیں دوسرے شہریوں جیسی مراعات میسر ہوں گی ۔ ان کے فرائض بھی دیگر پاکستانیوں جیسے ہوں گے ۔ اس سلسلے میں کسی ذات ، عقیدے یا فرقے کا کوئی امتیاز نہ ہوگا ۔ میرے ذہن میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انکے ساتھ پاکستان میں منصفانہ سلوک کیا جائے گا ۔

(انتقال اقتدار اور پاکستان (جلد دوم) ترتیب وترجمہ: محمد فاروق قریشی لاہور، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۴ - ۲۰۲)

(ز)۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں ایک نامہ نگار کے اس سوال کے جواب میں کہ آیا پاکستان میں دینی حکومت قائم ہوگی؟ جناح صاحب نے فرمایا:

" آپ ایک مہمل سوال پوچھ رہے ہیں ۔ میں نہیں جانتا کہ دینی حکومت سے آپ کا کیا مطلب ہے ۔ خدا کے لیے آپ لوگ اپنے دماغوں سے یہ خرافات نکال دیجئے ۔ "

(ہفت روزہ قومی آواز ۔ دہلی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء)

(ح)۔ ایک اہم دستاویز وہ حلف نامہ ہے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی سہ پہر کو کراچی میں بانی

پاکستان سے متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"میں محمد علی جناح قانون کے مطابق قائم ہونے والے پاکستان دستور حکومت سے سچی عقیدت اور وفاداری کا عہد مصمم کرتا ہوں کہ میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے شہنشاہ معظم جارج ششم و شہنشاہ برطانیہ اور ان کے ولی عہدوں اور جانشینوں کا وفادار رہوں گا۔"

(روزنامہ "پاکستان" لاہور کا ہفتہ وار ایڈیشن "تصور پاکستان" ۱۴ اگست ۱۹۹۳ء میں، ص ۱۱)

(ط) ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں جو پرچم پیش کیا تھا اور اس پر لیاقت علی خان نے جو تقریر کی، اس سے معلوم ہوا کہ اس پرچم کا تعلق اسلام سے نہیں، یہ پرچم آزادی اور مساوات کا پرچم ہے۔ لیاقت علی خان کے بقول: "ان کے ذہن میں پاکستان کی ریاست کا جو تصور تھا، اس میں کسی مخصوص فرقے کیلئے خصوصی حقوق و مراعات نہ تھیں۔

(ہندوستان اپنے حصار میں، ایم۔ جے۔ اکبر، ص ۲۸)

(ی) حوالے بہت سے ہیں، کہاں تک گنائے جائیں گے۔ میں یہاں صرف ایک حوالہ اور دوں گا اور بس! آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس ۱۴۔۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال، کراچی میں ہوا تھا۔ پنجاب کے سابق وزیر تعلیم غلام نبی ملک رقم طراز ہیں:

"ایک بزرگ نے قائداعظم سے سوال کیا: ہم قوم سے یہ کہتے آئے ہیں کہ "پاکستان کا مطلب کیا" لاالہ الااللہ "! تو قائد نے فرمایا کہ یہ درست ہے کہ یہ نعرہ تمام مسلمانوں کی زبان پر ہے اور یہ انکے دل کی آواز ہے لیکن یہ نعرہ میں نے ایجاد نہیں کیا اور نہ ہی میری ورکنگ کمیٹی یا کونسل نے کوئی ایسا ریزولیوشن پاس کیا ہے۔" (کاروان احرار از جانباز مرزا، جلد ۷، لاہور ۱۹۸۳ء ص ۲۵۹)

کیا اس کا مطلب نہیں کہ پاکستان کا وہ مطلب جو مسلمانوں نے سمجھا، جس کا نعرہ ان کی زبانوں پر تھا اور قائداعظم کے اعتراف کے مطابق جو ان کے دل کی آواز بھی تھی، خود انہوں نے اسے ماننے اور اس سچائی کو تسلیم کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ انہوں نے ایجاد نہیں کیا تھا یا ان کی ورکنگ کمیٹی یا کونسل نے بصورت قرارداد منظور نہیں کیا تھا؟ یا للعجب! اگر انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ قیام پاکستان کے مقصد کے بارے میں مسلمان غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی ان کی غلط فہمی کو دور نہیں کیا گیا تو یہ ان کے ساتھ صریح دھوکہ ہوا۔

کابینہ مشن پلان کی منظوری:۔

۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان منظور کیا تھا تو یہ اکھنڈ بھارت کی ایک انتظامی

سیاسی صورت تھی ۔لیکن یہ نہ پاکستان تھا، نہ اسلام نہ مسلمانوں کی مطلق العنان اور بلاشرکت غیرے حکومت تھی ۔ لیکن اسمیں ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کا حل موجود تھا ۔ اس پر مسلم لیگ کے صدر مطمئن تھے اور مسلم لیگ کونسل نے اسے بہ انشراح صدر قبول کیا تھا ۔

عارضی حکومت میں شمولیت :۔

کابینہ مشن کی ناکامی کے بعد جب مختصر مدت کا منصوبہ سامنے آیا اور عارضی حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کا مسئلہ پیدا ہوا ۔ تو قائداعظم نے مسلم لیگ کے پانچ نمائندوں میں سے ایک نمائندہ جوگندر ناتھ منڈل کو نامزد کیا، تو اس وقت ان کے سامنے مسلم لیگ کی، مسلم قومی یا اسلامی حیثیت کا سوال نہ تھا ۔ اگر یہ اسلام کا کوئی مسئلہ ہوتا تو قائداعظم کانگریس کی شرائط پر لیگ کے نمائندوں کو کبھی کابینہ میں شمولیت کی اجازت نہ دیتے ۔ اور منڈل کی نامزدگی اگر خوانخواستہ اسلامی احکام میں مداخلت ہوتی تو قائداعظم کبھی ایسی جرات نہ کرتے ۔ سر محمد یامین خاں کی خودنوشت نامہ اعمال کے تیسئیویں باب کا عنوان ہی یہ ہے ۔ " وائسرائے کی پریشانی اور قائداعظم کا لیگ کو کیبنٹ میں کانگریس کی شرائط منظور کرکے داخل کرنا ۔ (صفحہ نمبر ۱۱۸۳) وائسرائے کی پریشانی اور تائید کی مجبوری کی تفصیل بھی کتاب کے اسی باب (۲۳) کے مضمون میں موجود ہے ۔ اگر چہ لیگ کے دوسرے درجے کے بعض رہنما اور لیگ کے سب رہنما دوسرے اور تیسرے درجے ہی کی رہنما تھے ۔ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ مسلم لیگ ایک اسلامی جماعت ہے اور اس کی سیٹ پر ایک مسلمان ہی کو نامزد کیا جانا چاہیئے تھا ۔ اور اسی لیے ان میں اس فیصلے کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہوا تھا اور وہ اپنے قائد کو پریشان کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے ۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کی نادانی تھی

(تفصیل کے لئے دیکھیئے ، نامہ اعمال سر محمد یامین خاں)

بانی پاکستان کے خیالات کے چند نشیب وفراز :۔

(۹) ۳ جون ۱۹۴۷ء سے پہلے بانی تحریک کے خیالات میں نشیب و فراز کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ۔ مثلاً شملہ کانفرنس اور پھر اس کے بعد کیبنٹ مشن کی ناکامی کے بعد جب انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ انگریز ہندوستان کی حکومت کو ملک کی اکثریت یا کانگریس کے حوالے کردے گا اور مسلم لیگ کی پرواہ نہیں کی جائے گی تو انہیں اکثریت سے انصاف اور رواداری کی ہرگز کوئی توقع نہ تھی اور مسلمانوں کی عزت خاک میں ملتی ہوئی نظر آتی تھی ۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن کے کنگزوے ہال میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا : " کیا برطانوی حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ سنگینوں کے سائے میں اقتدار

ہندواکثریت کو سونپ دے ؟ اگر اس نے ایسا کیا تو مسلمانوں کی عزت خاک میں مل جائے گی اور انہیں انصاف اور رواداری کی کوئی توقع نہ رہے گی۔

(محمد علی جناح از ہیکٹر بولائیتھو (مترجم زہیر صدیقی) لاہور ۱۹۸۱ء (تیسرا ایڈیشن) صفحہ نمبر ۲۴۶)

لیکن ۳ جون کو تقسیم کے اعلان کے بعد مسٹر محمد علی جناح کا رویہ بالکل بدل گیا۔ اب کانگریس سے رویہ مصالحانہ ہوگیا۔ اب انہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی وجود کیلئے ہندو اکثریت سے انصاف اور رواداری کی پوری توقع پیدا ہوگئی۔ اب وہ مسلم اقلیت کے تحفظ اور اس سے انصاف اور رواداری کی برتاؤ کیلئے ہندواکثریت پر اعتماد کرسکتے تھے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"میں جانتا ہوں کہ مسلمانان ہندوستان سے بھی ایسا ہی منصفانہ سلوک کیا جائے گا جیسا کہ ہم غیر مسلم اقلیتوں سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے پالیسی کا بڑا اصول بتادیا ہے۔ لیکن دونوں قوموں کی اقلیتوں کی حفاظت کا مسئلہ آئین ساز اسمبلیاں ہی حل کرسکتی ہیں۔ اور اس اعتماد کی بنا پر انہوں نے مسلمانوں کو اسی ہندواکثریت کے حوالے کردیا۔ جس سے انہیں انصاف اور رواداری کی ہرگز کوئی توقع نہ تھی۔ اب ہندوستان کی حکومت ہندوستانی مسلمانوں کی اپنی حکومت ہوگئی تھی۔ اس کی اطاعت اور وفاداری ان پر لازمی اور اسکے خلاف ریشہ دوانیاں ناقابل برداشت قرار پائیں۔ انہوں نے پورے زور اور قوت کے ساتھ کہا:

"اقلیتوں کو حکومت کا وفادار رہنا پڑے گا اور حکومت کی اطاعت قبول کرنی پڑے گی۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اقلیتیں حکومت کی وفادار نہ ہوں۔ یا تخریبی اقدامات شروع کردیں۔ ہر شہری کیلئے ضروری ہے کہ وہ حکومت کا وفادار بنے۔" اگر چہ اس واضح اور صاف بیان کے بعد یہ شبہ نہ ہونا چاہئیے تھا کہ اس میں ہندوستان کی مسلمان اقلیت کے لیے کوئی مشورہ و ہدایت نہیں۔ لیکن بیان کو موثر بنانے کیلئے ایک صحافی (____) سے یہ سوال کروایا، جس کی پہلے ریہرسل کی گئی تھی: "آپ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی اقلیتیں حکومت کی وفادار اور اطاعت گذار رہیں۔ آپ ہندوستان کے اقلیتوں کے بارے میں بھی یہی کچھ کہیں گے؟ قائد نے جواب دیا:

"یہ تمام اقلیتوں کے بارے میں ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی اقلیت حکومت کی وفادار نہ ہواور حکومت کے خلاف کے خلاف تخریبی اقدامات شروع کردے تو اس کا یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ میں ہندوستان اور پاکستان کے ہر مسلمان اور ہندو شہری سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی حکومت کا

وفادار رہے۔

(گفتار قائداعظم مرتبہ احمد سعید، (اول) ۱۹۷۶ء (لاہور) ص ۱۵۔ ۳۱۲)

قائداعظم کا یہ بیان اتنا واضح اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پیٹھ کیلئے ایسا تازیانہ تھا کہ انکی آنکھیں کھل جانی چاہئیے تھیں۔ لیکن پچھلے دس سالوں میں دوقومی نظریے کا نشہ پلا کر ان کے حواس کو اس درجہ مختل کردیا گیا تھا، اس میں یہ امید پوری نہ ہوئی کہ ان کے بیان کی یہ تلخی ان کا یہ نشہ اتار دیتی۔ ان بیانات کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا نظریہ پاکستان کیا تھا اور اس میں اسلام، مسلمانوں کے اسلامی تشخص ومفادات، خالص سیاست، تدبر، حقیقت پسندی اور شوق حکمرانی کا تناسب کیا ہے؟ اس بیان کے بعد مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے مسلمانوں کو "اپنی حکومت" کی وفاداری کا مشورہ دے کر ان کی طرف سے تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوگئے۔ اب یہ معاملہ ہندوستان کی مسلم اقلیت اور ہندوستان کی حکومت کا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ان خیالات میں تبدیلی کی وجہ صرف یہ نہیں ہوسکتی کہ اب انہیں ہندوستان کی حکومت پر اعتماد پیدا ہوگیا تھا بلکہ یہ بھی تھی کہ پہلے انہیں پاکستان بنانے کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اب پاکستان بن گیا تو اسے چلانے کے لیے ان کے تعاون کی بجائے پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کی ضرورت تھی اس لئے ان کے بدلے میں ہندوستان کی مسلمان اقلیت کو ہندوستانی حکومت کی بھینٹ چڑھادیا۔ اگر چہ ایک مسلمان رہنما کی سیرت کی یہ کوئی اچھی مثال نہیں تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھی خالی نہیں ہوسکتی کہ کسی شاطر سیاست دان نے ایک جماعت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہو اور جب مقصد پورا ہوگیا ہو تو انہیں حالات کے حوالے کردیا ہو۔ جناح صاحب کے افکار اور کردار میں نشیب وفراز کی کئی اور مثالیں اس مقالے میں پہلے بھی آچکی ہیں۔ اس لیے اس بحث کو مزید طویل دینے کی ضرورت نہیں۔

سیکولر اسٹیٹ کی تاسیس:۔

۱۳ جولائی ۱۹۴۶ء کا یہ انٹرویو بانی پاکستان کے سیکولر اور غیر فرقہ وارانہ رویے کا کوئی آخری مظاہرہ نہ تھا۔ چنانچہ تقسیم ملک کے اعلان پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے قیام، کابینہ کی تشکیل کے موقع پر اور اس کے بعد ان کے اس حقیقت پسندانہ اور مدبرانہ رویہ کے کئی مظاہرے ہوئے۔ مثلاً۔

(۱): اسلامی مملکت خداداد کی دستور ساز اسمبلی کا صدر جوگندر ناتھ منڈل کو بنایا۔

(۲): اسلامی مملکت خداداد کا پہلا وزیر قانون بھی منڈل کو بنایا۔ (۳): دنیا کی عظیم اسلامی مملکت جو عام خیال کے مطابق اسلامی نظریہ حکمرانی کے اصول پر مسلمانوں کی جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی، اس کا ترجمان خارجیہ (وزیر خارجہ) ایک قادیانی چوہدری ظفراللہ خاں کو بنایا۔
(۴): اور جب کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا اور پاکستان اس مقدمے میں ایک فریق بنا تو اقوام متحدہ میں اس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کے لیے پاکستان کے اسی وزیر خارجہ کو منتخب کیا گیا۔

یہ تمام باتیں بانی پاکستان کے غیر فرقہ وارانہ اور سیکولر رویے کی غماز ہیں۔ اگر مرحوم کے سامنے پاکستان کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں دستور سازی کا مسئلہ ہوتا تو کیا ان جیسا قانون دان دستور ساز اسمبلی کے صدر کے منصب کی نزاکتوں کو نظرانداز کر دیتا۔ اگر اس مسلمان مملکت میں اس کا نظریہ سیاست وحکمرانی قرآن وسنت پر مبنی ہوتا تو ہمارے علمائے کرام کے عقیدے اور فتوے کے مطابق وزارت قانون کا قلم دان کسی غیر مسلم کے حوالے کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اگر بانی پاکستان کے نزدیک اسلام کا یہ واقعی کوئی مسئلہ ہوتا تو کیا وہ اپنی ذاتی رائے سے اتنا بڑا فیصلہ کر دیتے اور پاکستان میں شیعہ، سنی، اہل حدیث، بریلوی، دیوبندی مکاتب فکر کے جید علماء ومجتہدین اسے آسانی سے مان لیتے اور ملک میں کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوتی؟ اور احرار اسلام کے سر پھرے علمانے جب اس کے خلاف تحریک چلائی تھی تو وقت کے کسی مفتی، مفسر، محدث، فقیہ اور مجتہد کو اس تحریک کے حق میں آواز بلند کرنے کی توفیق نہ ہوئی، بلکہ بعض حضرات نے اس تحریک کی مخالفت پر کمر کس لی تھی! اور اگر بعد کی حکومتوں کے سامنے یہی اسلامی اصول ہوتا تو کیا دساتیر میں وزارت عظمیٰ کے منصب تک کسی غیر مسلم کے پہنچنے کے لیے دروازہ کھلا رکھا جاتا؟

سیکولر ذہنیت کا آخری مظاہرہ:-

۱۱ اگست کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح نے افتتاحی تقریر کی اور اس میں نظام حکومت، دستور سازی، اقلیتوں کی حیثیت، قومیت کے نظریے، پاکستان میں مذہب کے مقام وغیرہ مسائل میں حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا۔ حکومت کی سیکولر پالیسی کے اظہار کے لیے ایک غیر مسلم کو قانون کا شعبہ پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا چیئرمین بھی منڈل تھا اور اسی کی صدارت میں یہ اجلاس ہوا تھا اور حکومت کی سیکولر پالیسی کے تقاضے کا اس درجہ احترام کیا گیا تھا کہ اجلاس کے آغاز میں قرآن حکیم

کی تلاوت بھی نہیں کی گئی تھی۔ قائداعظم، گورنر جنرل کی تقریر پاکستان میں رنگ ونسل اور عقیدہ ومذہب کے امتیاز کے انکار، حقوق، مراعات اور فرائض میں برابری، فرقہ وارانہ امتیازات کے خاتمے، مذہب اور عقیدہ ومسلک کا ریاست کے امور سے عدم تعلق، مذہب اور عقیدے کی بنا پر تفریق کی نفی اور ریاست کا شہری ہونے کے تعلق سے مسلم اور غیر مسلم کی یکساں حیثیت، سیاسی معنوں میں آئندہ ہندو کا ہندو اور مسلمان کا مسلمان نہ رہنے کے ادعا اور مذہب کو ہر فرد کا نجی معاملہ قرار دینے کے اعلان وغیرہ مضامین سے پر تھی۔ گورنر جنرل پاکستان کی اس تاریخی تقریر کے اہم نکات یہ ہیں:

"...... پاکستان کی عظیم ریاست کو اگر ہم آسودہ وخوشحال اور ثروت مند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام کی فلاح پر تمام تر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی اور ان میں بھی عام لوگوں بالخصوص نادار آبادی کی فلاح مقدم ہے۔ اگر آپ نے ماضی کی تلخیوں کو فراموش کرکے اور ناگواریوں کو دفن کرکے باہم تعاون سے کام کیا تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ اگر آپ نے ماضی کی روش بدل دی اور آپس میں مل جل کر اس منصوبے کے ساتھ کام کیا کہ آپ میں سے ہر شخص خواہ وہ کسی بھی فرقے سے ہو، خواہ ماضی میں آپ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو، اس کا رنگ، ذات، پات یا مسلک خواہ کچھ بھی ہو وہ شخص اول و آخر اسی ریاست کا شہری ہے اور اس کے حقوق، مراعات اور فرائض برابر کے ہیں، تو یاد رکھیے کہ آپ کی ترقی کی کوئی حدوانتہا نہ ہوگی۔"

"میں اپنی بات اس سے زیادہ شدت سے نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں اس جذبے کے ساتھ اپنا کام شروع کرنا چاہیے اور وقت گزرنے کے ساتھ اکثریتی اور اقلیتی فرقے، ہندو فرقے اور مسلمان فرقے کے یہ سارے امتیازات ختم ہوجائیں گے۔ کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں بھی پٹھان، پنجابی اور سنی، شیعہ وغیرہ بہت سے امتیاز ہیں اور ہندوؤں میں برہمن، وشنو، کھتری اس کے علاوہ بنگالی، مدراسی وغیرہ کے اختلاف موجود ہیں۔"

"دراصل آپ اگر مجھ سے پوچھیں تو میں یہی کہوں گا کہ ہندوستان کے لیے آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی تھی اور اگر یہ امتیازات نہ ہوتے تو ہم لوگ مدتوں پہلے آزاد ہوگئے ہوتے! کوئی طاقت کسی قوم کو اور وہ بھی چالیس کروڑ باشندوں کی قوم کو غلام بناکر نہیں رکھ سکتی تھی۔ کوئی فرد آپ کو فتح نہیں کرسکتا تھا اور یہ حادثہ اگر ہو بھی چکا تھا تو کسی بھی عرصے کے لیے وہ اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ بہ شرط یہ کہ تفرقے کی یہ صورت نہ ہوتی۔ لہذا اس تجربے سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے۔" "اب آپ آزاد ہیں۔ آپ کا ملا آزاد ہیں کہ اپنے مندروں

میں جائیں ۔ آپ کو پوری آزادی حاصل ہے کہ اپنی مسجدوں کا رخ کریں یا پاکستان کی ریاست میں جو بھی آپ کی عبادت گاہیں ہیں ، ان میں آزادی سے جائیں ۔ آپ کا کوئی بھی مذہب ، ذات یا مسلک ہوسکتا ہے ریاست کے امور سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ۔"

" جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ پہلے برطانیہ میں بھی اس ملک کے حالات ہندوستان کے موجودہ حالات سے کہیں بدتر تھے ۔ رومن ، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ایک دوسرے پر عذاب توڑتے تھے ۔ حتیٰ کہ اب بھی بعض ریاستیں موجود ہیں ، جہاں کسی خاص طبقے کے خلاف امتیاز برتاجاتا ہے اور اس پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں ، خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنا آغاز اس دور میں نہیں کیا بلکہ ہم نے ابتدائے کار اس دور سے کی ہے جب دو فرقوں کے درمیان کوئی تخصیص اور کوئی امتیاز روار کھا نہیں جاتا ، ایک مذہب یا ایک عقیدہ اور دوسری ذات یا دوسرے عقیدے کے لوگوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی ۔ ہم اپنے معاملات کا آغاز اس بنیادی اصول کے ساتھ کررہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں اور برابر کے شہری ہیں ۔" "

.... میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کو ہمیں بھی بطور مثال پیش نظر رکھنا چاہئیے ۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہندو ، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان ، مسلمان نہیں رہیں گے ۔ میں یہ بات مذہبی معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں ، کیوں کہ یہ تو ہر فرد کے نجی عقیدے کا معاملہ ہے ، بلکہ ریاست کے باشندے ہونے کی بناپر سیاسی معنوں میں ۔"

یقین نہیں آتا کہ یہ خیالات تحریک پاکستان کے قائداعظم یا مسلم لیگ کے صدر یا دوقومی نظریے کے داعی اور پاکستان کے بانی کے ہیں ؟ آخر کوئی کانگریسی یا نیشنلسٹ لیڈر ، سوشلزم کا مبلغ ، سیکولر ذہنیت کا مالک اور لادینی حکومت کا داعی بھی اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا ؟ اور اس سے زیادہ کسی نے کیا کہا تھا ؟

آخری استدلال :-

بانی پاکستان کے خیالات میں یہ تبدیلی اچانک نہ آگئی تھی ۔ یہ ان کی مدت سے ہمیشہ سے ایک سوچی سمجھی رائے تھی کہ پاکستان کے لیے سیکولر نظام حکومت ہی مناسب ہوگا ۔ راجہ صاحب محمود آباد سے بڑھ کر ان خیالات پر کون گواہ ہوسکتا ہے ۔ وہ انہیں چچا کہتے تھے ۔ ان کی حیثیت " شہد شاهد من اهلها " کی سی تھی ۔ ان کا بیان ہے ۔ " مجھ میں اور قائد میں ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان اسلامی ریاست کے مسئلے پر اختلاف رائے ہوگیا تھا ۔ میں پاکستان میں اسلامی

ریاست کے قیام کا حامی تھا اور قائداعظم سیکولر ریاست کے حق میں تھے۔ چنانچہ قائداعظم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سے ان خیالات کا اظہار نہ کروں، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ قائداعظم ان خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی ہدایت پر میں ان کے خیالات عوام تک پہنچارہا ہوں۔" عجب بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں جناح صاحب پاکستان میں اسلامی نظام چاہتے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بات کو بطور الزام بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان افکار وخیالات کی روشنی میں فیصلہ کرلیا جاسکتا ہے کہ بانی پاکستان کا نظریہ پاکستان کیا تھا۔

آج اس بحث کی گنجائش ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے کی بانی پاکستان کی دعوت کی واقعی قدر وقیمت کیا تھی اور ۳ جون ۱۹۴۷ء کے فیصلے کے بعد ان کا رویہ کتنا حقیقت پسندانہ ہوگیا تھا اور کیا صحیح تھا اور کیا غلط؟ اب یہ مورخین کا موضوع بحث ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ اگر قائداعظم کے افکار وافادات کو فیصلے کی بنیاد بنایا جائے تو اس میں اسلام کے سوا سب کچھ مل جائے گا۔

حضرات! میں اس مقالے میں بہ دلائل ثابت کرچکا کہ قائداعظم کے افکار میں پاکستان کی اسلامی نظریے کی بنیاد تلاش کرنا محض کارعبث ہے۔ پاکستان کی دستور سازاسمبلی نے جو نظریہ پاکستان وضع کیا ہے اور دستور میں اسے اتنی بلند جگہ دی گئی کہ اس پر تنقید یا اس سے انحراف قابل تعزیر جرم قرار پایا۔ حالانکہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی ضابطہ وقاعدہ قابل احترام تو ہوسکتا ہے، تنقید سے بلند نہیں۔ عقائد اسلامیہ حقہ کے بعد کسی دستور ساز اسمبلی کا کوئی سیاسی فیصلہ مسلمان عقیدہ اسلامی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ بالفرض اس نظریہ پاکستان کی حقیقت کچھ بھی ہو، اس کا تعلق قائداعظم کے نظریہ پاکستان سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ ان کے بارے میں بدگمانی ہے اور قرآنی تعلیمات کے مطابق بدگمانی گناہ میں داخل ہے۔ مسلمانوں کو چاہئیے کہ وہ اس بدگمانی سے توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ اس مسئلے پر ایک اور طرح بھی نظر ڈال لیجئے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح اپنے اعلان کے مطابق (مارشل لا سے مارشل لا تک، مرتبہ نوراحمد، لاہور ۱۹۶۶ء، صفحہ ۵۳) ، بچپن کی رسوم مثلاً عقیقے کی اہتمام کے مطابق (میرا بھائی، از فاطمہ جناح) رجسٹر نکاح میں اندراج کے مطابق (جس میں نکاح خواں، وکلا اور گواہ سب شیعہ تھے) محمد بن قاسم سے محمد علی جناح تک از شفیق بریلوی وقائداعظم محمد علی جناح کی نجی زندگی کے دو اہم پہلو از شریف الدین پیرزادہ، ۱۹۸۸ء کراچی، صفحہ ۲۷۔ ۲۸ ورتی جناح از خواجہ رضی حیدر ۱۹۹۵ء، کراچی، ص ۴۶۔ ۴۷) اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کے بیان کے مطابق (میرا بھائی، مترجمہ اقبال حسین قادری، ۱۹۷۸ء، لاہور، ص ۲) اپنے دوستوں، جی۔ اے الانا (.......)، ایس۔ ایچ اصفہانی (اخبار خواتین، کراچی،

آخری شمارہ دسمبر ۱۹۷۶ء) کے مطابق، اپنے مصنفین رئیس احمد جعفری (قائداعظم اور انکا عہد، لاہور، صفحہ ۲۴ وحیات محمد علی جناح، لاہور ص ۱۳۱)، خالد بن سعید (پاکستان دی فارمیٹوفیز، صفحہ ۱۸۱)، ایس۔ پی۔ سین (مقالہ مشمولہ ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی، ۱۹۷۳ء کلکتہ، ص ۲۴۱)، نریش کمار جین (مسلمز ان انڈیا۔ اے بایوگرافیکل ڈکشنری (جلد اول) ۱۹۷۹ء نیو دہلی، ص ۲۲۹) اپنے خورد اور عقیدت کیش راجہ صاحب محمود آباد کے مطابق (تقریر مطبوعہ زمزم، لاہور، ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء ومدینہ۔ بجنور، یکم دسمبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۱)، تشکیل پاکستان میں شیعان علی کا کردار (مرتبہ محمد وصی خاں، کراچی، ۱۹۸۲ء) کے بیسیوں مقالہ نگاروں کے مطابق، حتیٰ کہ آخر میں انتقال کے بعد غسال میت آخری رسوم اور امام اور مقتدیان نماز جنازہ کے اہتمام کے مطابق (یہ روایت مولانا انیس الحسنین شیعہ عالم جنہوں نے گورنر جنرل ہاؤس میں شیعہ طریقے کے مطابق آخری رسوم انجام دی تھیں اور نماز جنازہ پڑھائی تھی، انٹرویو مطبوعہ ہفتہ روزہ نیشن، کراچی، ۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء) وہ اثناء عشری شیعہ تھے یا خوجہ اسماعیلی آغا خانی تھے۔ اگر وہ شیعہ تھے تو وہ عقیدہ رکھنے میں بالکل آزاد تھے۔ اگر ہم اپنے مسلمان اور حنفی ہونے پر بلکہ دیوبندی اور بریلوی ہونے کا اہل حدیث ہونے پر فخر کرسکتے ہیں تو بانی پاکستان کو بھی اپنے شیعہ ہونے پر فخر کرنے کا حق تھا۔ یہ بات خدانخواستہ طنزاً نہیں لکھ رہا، بلکہ ایک حقیقت کا پوری سنجیدگی کے ساتھ اظہار کررہا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد نے ان کا شیعہ ہونا اپنے اور اہل تشیع کے لیے خوش قسمتی کا موجب قرار دیا ہے۔

حضرات! یہ کیا بات ہے کہ آپ ایک شیعہ کو اس کے عقیدے میں مخلص سمجھتے ہیں۔ مذہب واعتقاد میں اسکا حق اختیار تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ایک خوش فہمی میں مبتلا ہیں یا اس کے بارے میں یہ سوء ظن رکھتے ہیں کہ وہ سیاسی نظام قائم کرتا تو اپنے عقیدے کے برعکس آپ کے عقیدے کے مطابق؟ ایک طرف تو آپ انہیں پختہ کیریکٹر کی شخصیت تسلیم کرتے ہیں دوسری طرف ان سے منافقت کی امید باندھ رکھی تھی۔ یہ محض آپ کی سادگی ہے۔ اب آپ اس خوش فہمی سے نکل آئیے، سادگی کو ترک کردیجئیے اور حقیقت کا مردانہ وار ایک مسلمان کی طرح مقابلہ کیجئے۔

بانی پاکستان شیعہ تھے، وہ اپنے عقیدے میں راسخ و مخلص تھے۔ وہ اگر اسلامی حکومت کے قیام کے دل سے خواہاں ہوں گے، لیکن اپنے عقیدے کے مطابق نہ کہ آپ کی آرزوؤں کے مطابق؟ اگر حالات سازگار ہوتے تو وہ اپنے عقیدے کے مطابق ضرور ایک شیعہ اسٹیٹ قائم کرتے۔ پاکستان کی بعض جماعتیں جو فقہ جعفریہ کا نفاذ چاہتی ہیں یا پاکستان کو شیعہ اسٹیٹ بنانا چاہتی ہیں، وہ یقیناً

اپنے قائداعظم کی ناآسودہ آرزوؤں کی تکمیل کیلئے کوشاں ہیں ۔ ان کے جذبہ ایمان اور ذوق قیام ملت شیعہ میں ہمارے لیے عبرت اور سبق ہے ۔ اگر حالات نے بانی پاکستان کی خواہش کے مطابق کروٹ نہیں لی تھی اور پاکستان کو شیعہ اسٹیٹ بنانے کی ان کی آرزو پوری نہیں ہوسکی تھی تو ان کے سامنے صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ پاکستان کو ایک لادینی ، جمہوری اور سیکولر اسٹیٹ بنادیں ۔ بلاشبہ انہوں نے اس میں اپنی پوری ذہنی وفکری قوت صرف کردی ۔ اب آپ حضرات کی ہمت اور بصیرت کی آزمائش ہے کہ آپ بانی پاکستان کے حوالے کے بغیر مسلمانوں کے دیرینہ خواب حکومت الٰہیہ کی تعبیر تلاش کریں گے ۔

بانی پاکستان کے افکار کا حوالہ مسئلے میں الجھاؤ تو پیدا کرسکتا ہے ، مسئلے کے سلجھاؤ میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی ۔ یاد رکھیے کہ پاکستان کے قیام میں اس کے بانی کے مساعی کا شکریہ ہم ادا کرچکے ۔ پاکستان میں حکومت الٰہیہ علی منہاج النبوۃ وعلی منہاج الخلافۃ الراشدہ کے قیام کیلئے ہم ان کے افکار کی رہنمائی کے منت گذار نہیں ہوسکتے اور فی الحقیقت ان کے افکار میں کوئی ایسی رہنمائی ہے بھی نہیں ۔

یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس میں ایک مثالی مسلمان حکومت قائم کرکے ہی دم لیں گے ۔

ضروری اطلاع

معزز قارئین ماہنامہ "الحق" اور مقالہ نگار حضرات سے گزارش ہے کہ پرچہ سے متعلق جملہ ڈاک ، مضامین یا کوئی بھی شکایت ہو تو مدیر اعلیٰ مولانا سمیع الحق صاحب ، مدیر حافظ راشدالحق سمیع یا ناظم شفیق فاروقی و نثار محمد سے رابطہ کریں ۔ انکے علاوہ کسی اور ذریعہ سے رابطہ نہ کریں ورنہ ادارہ جواب دینے اور مضمون وغیرہ شائع کرنے سے معذور ہوگا ۔

(شکریہ ۔ ادارہ)
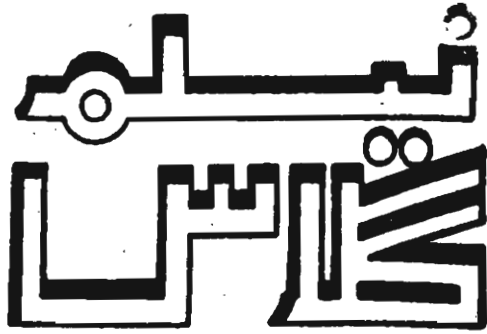
جناب مولانا قاضی عبداللطیف صاحب سابق سینٹر
امیر جمعیت علماء اسلام سرحد

پاکستان کا یوم تاسیس اور ارباب اقتدار کا کردار

۱۴ اگست ۱۹۹۷ء کو پاکستان کے پچاس سال مکمل ہوجائینگے ۔ پاکستان کی نئی نسل سن کہولت تک پہنچ جائیگی ۔ اس طویل عرصہ میں ہم نے کیا کھویا ؟ کیا پایا ؟ ۔ اس کا اندازہ ہمارے آنے جانے والے ارباب اقتدار کے ھزیانی بیانات سے کیا جاسکتا ہے ۔ ہر آنے والا جانے والے پر طعن حرف بھیجتا ہے ۔ پیپلز پارٹی کی مرحوم حکومت نے قوم کو بیوقوف بنانے کی خاطر ایک سال تک پچاس سالہ جشن منانے کا پروگرام بنایا ۔ اللہ تعالیٰ نے اس فریب کاری کی سزا میں اس جشن کو پارٹی کیلئے ماتم میں تبدیل کردیا ۔ جہاں باشندگان ملک کی جان ومال اور عزت محفوظ نہ ہو ، جہاں مظلوم کو انصاف توقع اور سہولت میسر نہ ہو ، جہاں ارباب اقتدار بڑی بے رحمی سے ملک کے خزانے اور وسائل کو لوٹ رہے ہوں ، جہاں ملک کے سرحدات محفوظ نہ ہوں ، جو حکومت کشمیریوں کو ۵۰ سال میں اپنا حق خودارادیت دلانے میں ناکام ہو جو بین الاقوامی سطح پر قومی خودداری کا سودا کرنے میں شرم محسوس نہ کرتی ہو ، جسکے عیش پرست حکمرانوں نے آنے والی نسلوں کو بھی اپنی عیش پرستی میں گروی رکھ دیا ہو ، اس حکومت اور اس قوم کو سال بھر تک جشن منانے پر شرم آنی چاہیئے ۔ ملک کا ہرذی ہوش یہ محسوس کرتا ہے کہ دراصل پیپلز پارٹی ملک سے اسلام اور خود داری کا جنازہ نکالنے کا جشن منارہی تھی ۔ مگر افسوس کہ اس ملک دشمن حکومت کی جگہ آنے والی ، قائداعظم ، علامہ شبیر احمد عثمانی ، لیاقت علی خان اور دوسرے بانیان پاکستان کی وراثت کی دعویدار حکومت نے بھی اس لغو او خالص فریب پروگرام کو جاری رکھنے کا جواز عطا کیا ۔ ع وائے گردرپس امروز بود فردائے

بڑے طویل عرصہ کے بعد قوم نے نواز شریف کی قیادت میں قائداعظم ، علامہ شبیر احمد عثمانی ، لیاقت علی خان کی مسلم لیگ کی وراثت کے طور پر بھاری اعتماد کرکے اقتدار پر لایا ، لیکن یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ موجودہ حکومت کے چھ ماہ کا عرصہ قوم کو توقعات کی بجائے مایوسی کی طرف دھکیل رہی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ پچاس سال کی بدعنوانیوں ، تباہ کاریوں کی ساری ذمہ داری نواز شریف کے کندھوں پر نہیں ڈالی جاسکتی اور یہ بھی غلط نہیں کہ صرف چھ ماہ میں سابقہ غلط حکمرانوں کی غداریوں ، غلطیوں اور تباہ کاریوں کا ازالہ بھی نہیں کیا جاسکتا ۔ تاہم یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں کہ موجودہ حکومت کے ششماہی اقدامات سے یہ تاثر عام ہے کہ نواز شریف نے ملک کے نشیب وفراز اور اپنی سابقہ دور حکومت کی کوتاہیوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ۔ آج بھی وہی کچن کابینہ اپنے سابقہ کردار کے ساتھ موجود ہے ۔ وزیراعظم کے قوم سے پہلے اور تیسرے

خطاب کے درمیان زمین و آسمان کا فرق محسوس کر کے قوم کو کوئی خوشی نہیں ہوئی ۔ چھ ماہ کے عرصہ میں چند دستوری اور قانونی ترامیم کو اگر چہ بیکار نہیں کہا جاسکتا تاہم اس سے یہ تاثر قائم نہیں ہوا کہ یہ قائداعظم ، علامہ شبیر احمد عثمانی اور لیاقت علی خان کی جانشین مسلم لیگ ہے ۔ قائداعظم نے ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء کو مسٹر بدرالدین سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا ۔ مسٹر بدر ! میرا ایمان ہے کہ قرآن و سنت کے زندہ جاوید قانون پر مبنی ریاست پاکستان دنیا کی بہترین ریاست ہوگی ...... مجھے اقبال سے پورا اتفاق ہے کہ دنیا کے تمام مسائل کا حل اسلام سے بہتر کہیں نہیں ملتا ۔ (سعید راشد قائداعظم گفتار کردار ص ۵۱۰ مکتبہ میری لائبریری لاہور) جناب وزیراعظم کا آئین پر نظر ثانی کا اعلان اگر چہ خوش آئند ہے لیکن انتہائی ادھورا ، بودا اور نظریہ پاکستان کی تکمیل کے لحاظ سے نامکمل ہے ۔ اپنے جمہوریت سے متصادم دفعات کو ختم کر دینے کا تذکرہ تو ضروری سمجھا لیکن اسکی ضرورت محسوس نہیں کی کہ قرارداد مقاصد سے متصادم دفعات کو بھی ختم کیا جائیگا جبکہ قرارداد مقاصد دستور پاکستان کی روح اور مرکزی نقطہ ہے ۔ پاکستان کے پچاس سالہ نشیب و فراز کے باوجود قرارداد مقاصد ہر دستور میں شامل رہی ۔ قائداعظم نے بلاخوف لومۃ لائم یہ اعلان کیا تھا کہ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی اطاعت ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن حکیم کے احکام اور اصول ہیں ۔ اسلام میں نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے اور نہ پارلیمان کی ، نہ کسی شخص یا ادارہ کی ۔ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست اور معاشرہ میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کر سکتے ہیں ۔" ملت کا پاسبان " ص ۳۳۰ اسی اعلان میں آپ نے عوام کو فوری انصاف مہیا کرنے کیلئے ترامیم کا تذکرہ بھی کیا ۔ یہ آواز اور اعلان کوئی نیا مژدہ نہیں ۔ حتیٰ کہ شہید اسلام جنرل ضیاء الحق مرحوم شروع اقتدار سے زندگی کے آخری لمحات تک اس کیلئے خلوص دل سے کوشاں رہے ۔ لیکن جو مشکلات قانون اور قانون دانوں کی طرف سے اسے درپیش تھے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ۔ یہ اعلان اگر واقعی خلوص دل سے ہے اور ہمیں اس پر شک کرنے کا کوئی حق بھی نہیں تو اس کا علاج آپکے قانونی مشیروں کا مرتب کردہ آرڈیننس نہیں اس سے مشکلات میں اضافہ ہوگا ۔ مظلوموں کی دادرسی ناممکن ہوگی ۔ اسکا صاف اور سادہ علاج شرعی عدالتوں کو اپنی صحیح عدالتی پوزیشن اور اختیارات دیگر تمام فوجداری مقدمات شرعی ضوابط اور شرعی قوانین کے مطابق انہیں تفویض کئے جائیں ۔ آج کی دنیا میں امن واماں کی مثالی صورت حال یا تو سعودی عرب میں ہے اور یا طالبان کے زیر کنٹرول افغانستان میں ۔ عوام کو اگر ۱۴ اگست کی خوشیوں میں شریک کرنا ہے تو انہیں جینے کا حق دو ۔ ملک کے وسائل میں انکو شریک کرو ، عوام ہی کے تعاون سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت کو واپس لایا جاسکتا ہے ۔ بصورت دیگر چین اور طالبان کے انقلاب کا انتظار کرو ۔ اور اس نعرہ کے بلند ہونے سے پہلے وقت اور حالات سے سبق لو ۔ جبکہ یہ نعرہ بلند ہو :

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو

جناب محمد فاروق قریشی صاحب (لاہور)

پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل؟

پاکستان میں جمہوریت کیوں نہ پنپ سکی۔ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ اس کے جواب کے سب متلاشی ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں ملک دولخت ہوگیا۔ حمود الرحمن کمیشن مقرر ہوا۔ اول تو بھٹو نے اس کی ٹرم آف ریفرنس ہی غلط رکھی تھی۔ لہذا اس کی رپورٹ اسی بنیاد پر لکھی جانی تھی۔ بہرحال کمیشن نے متعدد سیاستدانوں اور دیگر افراد کے بیانات قلم بند کیے۔ آخر کار رپورٹ تیار ہوگئی اور آج تک منظر عام پر نہیں آئی۔ حالانکہ اسے شائع ہونا چاہیے تھا تاکہ پاکستان کے عوام کو معلوم ہوسکتا کہ ان کے ساتھ یہ المناک حادثہ کیونکر پیش آیا۔ یہ سازش تھی یا عسکری محور پر شکست یا پھر ہندوستان اور روس نے ناجائز مداخلت کرکے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو قائم ہونے والے پاکستان کے دو ٹکڑے کردیئے۔ ایک بات طے ہے کہ بھٹو نے شکست خوردہ فوجی اداروں کو از سرنو تعمیر کیا۔ اسے پھر لڑانے کے قابل بنایا۔ اس ادارہ نے ماضی کی طرح ملکی دفاع میں کوئی کارکردگی نہ دکھائی، البتہ ۱۹۷۱ء میں اپنے ہی ملک کو ایک مرتبہ پھر فتح کرنے میں ضرور کامیابی حاصل کی۔ اپنے ہی ملک کو فتح کرنے کی اس ادارہ کی پرانی روایت ہے۔ ایوب خان نے فتح کیا۔ یحیٰ خان نے فتح کیا اور آخر میں جنرل ضیاء الحق نے فتح کیا۔ پاکستان کی پچاس سالہ زندگی میں فوجی راج کے براہ راست حکمرانی کے 23 برس بنتے ہیں۔ جب نصف کے لگ بھگ پیریڈ فوجی حکمرانوں نے صرف کیا اور وہ اپنے نظام کا تجربہ کرتے رہے تو جمہوریت کا مستقبل کیا ہوسکتا تھا۔

پاکستان کے مؤرخوں نے ملک کی سیاسی فضا سے مرعوب ہوکر ایسی ایسی افسانہ طرازیاں کیں کہ تاریخ کا معلوم چہرہ ہی مسخ کردیا۔ کبھی یہ کہا گیا کہ ابتداء کے چند سالوں کو چھوڑ کر بگاڑ بعد میں پیدا ہوا۔ یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ کیونکہ تاریخی حقائق وواقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بلکہ دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ جمہوریت کے خلاف سازش کی ابتداء اپنی ابتدائی ایام میں ہوئی۔ حالانکہ دونوں مملکتوں کے اعلیٰ قیادتوں نے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بٹن کو یقین دلایا تھا اور اس یقین دہانی کا تذکرہ آخری وائسرائے نے انتقال اقتدار کے وقت کیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ " دونوں مملکتوں کی حکومتوں نے اس امر کی ضمانت دی ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے سیاسی مخالفین کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ ان الفاظ

کے احترام کا مقصد اس سے کمتر نہ ہوگا کہ یہ انسانوں کے عقیدہ کی آزادی کا چارٹر ہے۔“

لیکن ان اعلیٰ اقدار کی آواز ابھی فضا میں گونج رہی تھی کہ قیام پاکستان کے صرف سات روز بعد ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو صوبہ سرحد کی اکثریتی وزارت کو برطرف کردیا گیا۔ کسی محوری حمایت کے ادارہ کو غیر جمہوری اور غیر آئینی طریقے سے توڑنے کا ارباب اختیار کی طرف سے یہ پہلا قدم تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وزیراعظم صوبہ سرحد ڈاکٹر خان صاحب اور ان کی جامعیت خدائی خدمتگاروں نے مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ فلسفہ سیاست ہندوستان کی تقسیم سے اختلاف رائے کا برملا اظہار کیا تھا۔ یہ ان کا جمہوری حق تھا اور اختلاف رائے کے جمہوری حق سے کسی کو محروم نہیں بنایا جاسکتا۔ آخر مسلم لیگ نے بھی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ایک نیا فلسفہ سیاست ایجاد کیا تھا۔ اس سے برعظیم ہندوستان کے تمام مسلمان متفق نہ تھے اور ہو بھی کیسے سکتے تھے۔ ایک بہت بڑا طبقہ اس سے اختلاف رائے رکھتا تھا۔ ان میں خدائی خدمتگار تھے۔ احرار تھے، خاکسار تھے،۔جمعیت علماء ہند تھی، مومن کانفرنس تھی، آل انڈیا شعبہ پولیٹیکل کانفرنس تھی اور دیگر مسلمان تھے۔ جو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے۔ تو کیا یہ سب گردن زدنی تھے؟ پھر مسلم لیگ کے نظریہ کا ساتھ کس طرح دیا جاسکتا تھا جبکہ اسے خود قرار وقیام نہ تھا۔ ایک موقع پر مسلم لیگ تقسیم ہند منصوبہ سے دستبردار ہوگئی اور گروپ سکیم قبول کرکے اس نے متحدہ ہندوستان کو تسلیم کرلیا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ لوگ ارفع واعلیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ جنہوں نے مسلم لیگ کے فلسفہ سیاست سے اتفاق نہ کیا اور اپنے موقف پر استقلال کے ساتھ جمے رہے۔ ان کی عظمت اور مستقل مزاجی کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو برطرف کی گئی تھی۔ اس کے تقریباً دو ہفتے بعد خدائی خدمتگاروں کے صوبائی جرگہ، پارلیمانی پارٹی، زلے پختون اور قبائلی علاقوں کا ایک اجلاس ہوا۔ جسمیں کامل غور وخوض کے بعد مندرجہ ذیل ریزولیشن منظور ہوا۔

(الف) خدائی خدمتگار پاکستان کو اپنا وطن تصور کرتے ہیں وہ عہد کرتے ہیں کہ اس کے استحکام اور حفاظت کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرینگے اور اس مقصد کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کیلئے تیار ہیں۔

(ب) ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برخاست کرنا اور ان کی جگہ عبدالقیوم خان کو بٹھانا غیر جمہوری اقدام ہے۔ چونکہ ہمارا ملک نازک حالات سے گزر رہا ہے۔ اس لئے خدائی خدمتگار کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے۔ جس سے مرکزی یا صوبائی حکومتوں کے لیے مشکلات پیدا ہوں۔

(ج) ملک کی تقسیم کے بعد خدائی خدمتگار آل انڈیا کانگریس سے اپنا ناطہ منقطع کرتے ہیں۔ اس لیے ترنگے جھنڈا کا استعمال ترک کرکے آئندہ سے پارٹی کا نشان صرف سرخ جھنڈے کا استعمال کیا

کریں گے ۔ ان واضح اور غیر مبہم یقین دہانیوں کے بعد انتقامی کاروائیوں کا کوئی جواز نہ تھا ۔ لیکن بدخو حکمرانوں نے جمہوری اقدار کو پس پشت ڈالا اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا ۔ پہلے تو خان عبدالغفار خان اور ان کے کئی حواریوں کو گرفتار کرکے سزا دلوائی گئی اور پھر انہیں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت ۱۹۵۴ء تک جیل کی تنگ وتاریک کوٹھڑی میں بند رکھا ۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو جس قانون کے تحت برطرف کیا گیا تھا ، اسی پر کوئی آواز بلند نہ ہوئی تھی ۔ کسی نے مذمت میں ایک لفظ نہیں کہا تھا ۔ اس سے حکومت کے حوصلہ جوان ہوگئے ۔ اور سندھ میں محمد ایوب کھوڑو کو بھی چلتا کیا ۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حکومت کے اقدام کے خلاف احتجاج رجسٹر کرایا جاتا لیکن سب نے چپ سادھ لی ۔ اگر ابتدائی ایام میں احتجاج بلند ہوتا تو حکومت کو آئندہ اقدام کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ۔ مگر مصلحت آمیز چپ نے حکومت کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے ایک کے بعد ایک صوبائی حکومتوں کو توڑنا شعار بنا لیا ۔ آخر ایک روز ایسا بھی آیا کہ پنجاب کے سب سے بڑے منتخب جمہوری ادارہ صوبائی اسمبلی کو توڑ دیا اور نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی وزرات کو برطرف کردیا ۔ آخر کار غلام محمد ، جسے قائداعظم محمد علی جناح نے مالیات کا فنی ماہر ہونے کے حوالے سے وزارت میں شامل تھے ۔ انہوں نے صحت کی خرابی کی بناء پر مستعفی ہونے کی استدعا کی تھی ۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سازش کے ذریعہ خواجہ ناظم الدین کی جگہ گورنر جنرل بننے میں کامیاب ہوگیا ۔ وہ بالکل غیر سیاسی آدمی تھا ۔ اس نے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہ لیا تھا ۔ اسے اس ضمن میں کوئی تجربہ نہیں تھا ۔ وہ سیاست کے کارزار سے نہیں گزرا تھا ۔ نہ ہی سیاست کے نشیب وفراز سے واقف تھا ۔ دراصل مالیات کے غیر سیاسی لوگوں نے پاکستان کی جمہوری سیاست کا بیڑا غرق کرنے میں اہم کردار ادا کیا ۔ ایک غلام محمد ، جنہوں نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو اس وقت برطرف کردیا جب انہوں نے اسمبلی سے بجٹ پاس کراکر اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا تھا ۔ مگر غلام محمد کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔ دوسرے چوہدری محمد علی ، جنہیں اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ تھا کہ اس کے کہنے پر قائداعظم نے عبوری حکومت میں وزارت خزانہ مسلم لیگ کے پاس رکھی تھی وگرنہ قائداعظم نے تو خزانہ کا محکمہ اپنے پاس رکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کررہے تھے ۔ دراصل اسی وقت چوہدری محمد علی نے محسوس کرلیا تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت ملک چلانے کی صلاحیتوں سے محروم ہے اور اس نے تاروپود بکھیرنے شروع کردیئے تھے ۔ پھر چوہدری محمد علی ہیرا پھیری کرکے کابینہ سے بالابالا کابینہ سیکرٹری میں بیٹھے اور عملاً حکومت ان کے تصرف میں آگئی ۔ وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان اور قائداعظم محمد علی جناح کے رولر اور ان تضادات ایک طویل داستان ہے ۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے کشمیر کا مسئلہ اسی لئے پیدا کیا کہ وہ حیدر آباد حاصل کرلینے کے غیر حقیقت پسندانہ خواب میں گرفتار تھے ۔ جہاں وہ

اپنا حلقہ انتخاب بنانا چاہتے تھے۔ لیکن جب حیدر آباد اور کشمیر کا مسئلہ الجھ گیا تھا تو انہوں نے سندھ میں اردو کے بولنے والوں کو آباد کرنا شروع کیا۔ یہ دراصل نوابزادہ لیاقت علی خان کی خود غرضی کی انتہا تھی۔ اس کم عقلی اور غیر دانش مندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ کشمیر پاکستان کو مل سکا اور نہ ہی حیدر آباد دکن۔ حیدر آباد دکن کے پاکستان کے ساتھ ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ کشمیر ضرور بالضرور وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کے مغرورانہ رویہ کی وجہ سے پاکستان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی برطرفی کے بعد گورنر جنرل غلام محمد کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ وہ آمر مطلق بن گیا۔ مغربی پاکستان کے بالادست طبقات(جاگیرداروں، سول اینڈ ملٹری بیوروکریسی اور دیگر) کے گھٹ جوڑ نے ملک میں جمہوری اداروں کو پنپنے نہ دیا۔ مسلم لیگ کے علاوہ سیاسی جماعتوں کو وطن دشمن اور غدار قرار دینے کے عمل میں شدت آگئی۔ جس نے حکومت کے خلاف زبان کھولی انتہائی نظر بندی کی قانون کے تحت بلا مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دیا گیا اور اس کی کوئی مدت نہ تھی۔ جب غلام محمد گورنر جنرل نے قائداعظم کی یادگار میں آئین ساز اسمبلی پر ہاتھ صاف کیا تو وہ آئین سازی کا کام تقریباً مکمل کر چکی تھی۔ چند یوم بعد آئین اسمبلی میں پیش کردیا جاتا، مگر اس کا موقع ہی نہ آیا۔ مولوی تمیز الدین قومی اسمبلی کے سپیکر تھے انہوں نے سندھ ہائی کورٹ میں گورنر جنرل کے فرمان کو چیلنج کردیا۔ سندھ ہائی کورٹ نے ایک عمدہ فیصلہ سنایا اور رٹ آف ہنڈلیس جاری کردیا۔ لیکن گورنر جنرل کو سخت دھکا لگا۔ حکومت سپریم کورٹ میں گئی۔ تو وہاں چیف جسٹس ملک محمد منیر بیٹھے ہوئے تھے جو گورنر جنرل کے برادری برادر تھے۔ بس انہوں نے ڈنڈی ماری اور نظریہ ضرورت کے تحت گورنر جنرل کے حق میں فیصلہ داغ دیا۔ گورنر جنرل کے فرمان کی توثیق ہوگئی۔ لیکن ملکی سیاست میں جو قباحتیں پیدا ہوئیں انہیں اب تک دور نہیں کیا جاسکا۔ اول تو جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی پر چڑھنے نہیں دیا گیا۔ اگر کچھ دیر کے لیے چڑھی بھی تو مغربی پاکستان کے بالادست طبقات نے اسے چلنے نہ دیا۔ اسمبلیاں ٹوٹتی رہیں بنتی رہیں۔ حالانکہ اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ عدالتیں نظریہ ضرورت کے تحت حکومتی فرمان کو جائز قرار دیتی رہیں اور سیاست کا بیڑا غرق کرنے میں مددگار ثابت ہوتی رہیں۔ تاآنکہ نوازشریف کے کیس عدالت کا رویہ مختلف تھا۔ مگر اسے بالادست طبقات نے چلنے نہ دیا اور بے نظیر کولا بٹھایا۔ اسمبلیوں کی شکست و ریخت کی داستان بڑی طویل اور دلخراش ہے۔ یہ ایک مختصر سا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ معلوم ہوسکے کہ ملک کے بالادست طبقات کس انداز میں سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ ان طبقات کی موجودگی میں ملک میں جمہوریت اور جمہوری اداروں کا مستقبل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبقات نے جمہوریت کو بڑا شدید نقصان پہنچایا ہے۔ جبتک سیاسی جماعتیں ایک قوت اور طاقت کے طور پر منظم اور مربوط نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اور جمہوریت کی کشتی ڈگمگاتی رہے گی۔

جناب مولانا اجمل خان صاحب مدظلہ (لاہور)

تحریک آزادی میں علماء کا روشن کردار

برصغیر پاک وہند میں اسلام دو طرف سے آیا۔ مغرب سے مسلمان جرنیل محمد بن قاسم کے ذریعہ اور مشرق سے مسلمان تاجروں کے ذریعے۔ ۱۰۰۱ء میں سلطان محمود غزنوی نے پہلی مرتبہ لاہور پر حملہ کیا۔ اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے لشکر کشی کی۔ تراوڑی کے میدان میں راجپوت راجہ رائے پتھورا سے مقابلہ کیا۔ پہلی بار شکست کھا گیا۔ غوری غیرت مند مسلمان تھا قسم کھالی کہ جب تک شکست کا بدلہ نہیں لوں گا اس وقت تک غسل نہیں کروں گا اور کپڑے تبدیل نہیں کروں گا۔ ایک سال تک تیاری میں مصروف رہا۔ اگلے سال پھر آکر لڑائی کی اور کامیاب ہوا۔ اس کے بعد مختلف خاندان یکے بعد دیگرے برصغیر میں حکومت کرتے رہے۔ مغل حکمرانوں میں اورنگزیب عالمگیر ہوشیار اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ متدین اور عالم بھی تھا۔ اس کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ اس کے بعد جو لوگ تخت نشین ہوئے ان کی اکثریت نہ صرف یہ کہ نااہل تھی بلکہ بدعمل اور عیاش بھی تھی۔ عالمگیر کے پوتے جہاندار شاہ نے تخت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ایک منظور نظر طوائف کے بھائی کو دہلی کا افسر مقرر کیا۔ پھر جہاندار شاہ کے پڑپوتے محمد شاہ رنگیلے نے تو حد ہی کردی۔ اس نے لال قلعے کی اندر حوضوں میں شراب بھروا دی۔ (ایسے حکمرانوں کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوکر رہا)۔

۱۷۵۶ء میں نواب بنگال کا انتقال مرشد آباد میں ہوگیا۔ اس کی وصیت کے مطابق مرحوم کا پوتا سراج الدولہ ۲۵ سال کی عمر میں اس کا جانشین ہوا۔ یہ نہایت بیدار مغز اور ہوشیار نواب تھا۔ اس نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ انگریز تجارت کے لیے ہندوستان آئے تھے لیکن اب وہ آہستہ آہستہ اقتدار بھی حاصل کرتے جارہے ہیں اور اگر صوتحال یہی رہی تو ایک وقت آسکتا ہے کہ انگریز پورے ملک پر ہی قابض ہوجائے گا۔ اس نے انگریزوں کی یلغار کو روکنا چاہا۔ انگریز اسے کب برداشت کرسکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ شروع ہوگئی۔ آخر کار صلح ہوگئی لیکن انگریز کب آرام سے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے نواب سراج الدولہ کے خلاف بعض نامور امراء دربار جن میں میر

جعفر سپہ سالار افواج خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کو نواب کے خلاف سازش کرنے پر اکسایا۔ حالات سے تنگ آکر نواب کو باالآخر انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا۔ پلاسی کے میدان میں دونوں فوجیں صف آراء ہوئیں۔ خوب جنگ ہوئی۔ اس نازک حالت میں میر جعفر غدار نے نواب صاحب کو میدان جنگ سے بھاگ جانے اور جان بچانے کا مشورہ دیا یہ انگریز کی عیاری اور مکاری کا ایک عملی نمونہ تھا۔ جسکو اس غدار نے انجام دیا۔ اسکے بعد نواب صاحب کی فوج بھی بددل ہوکر بھاگ گئی۔ اس گھناؤنی سازش نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں کردیا۔ اب انگریزوں نے میر جعفر غدار کو اس کی نمک حرامی کا انعام یہ دیا کہ سراج الدولہ کی جگہ اس کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نواب بنادیا۔ اس کے بعد میر جعفر نے نواب سراج الدولہ کو گرفتار کرکے قتل کرادیا۔ لیکن نمک حرام بدبخت میر جعفر کے انتقام کی پیاس پھر بھی نہ بجھی اور اس نے مقتول نواب کی لاش کو ایک ہاتھی کے ہودج پر سوار کراکر تمام شہر مرشد آباد میں گشت کرایا۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس سانحہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا:

جعفر از بنگال وصادق از دکن ننگ ملت ننگ دیں ننگ وطن

۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں تیسری لڑائی ہوئی جس میں غازی احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے برے عزائم کو خاک میں ملادیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ احمد شاہ ابدالیؒ کی فوج کی کل تعداد نوے ہزار تھی اور کل تیس توپیں تھیں جب کہ اس کے مقابلہ میں مرہٹوں کی صرف لڑاکا فوج کی تعداد تین لاکھ تھی جب کہ اس کی فوج کی پشت پر شہروں میں مقیم لوگ بھی تھے۔ اس کے پاس تین سو توپیں تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سورج غروب ہونے تک مرہٹوں کا غرور ٹوٹ چکا تھا اور شام کو میدان جنگ ان کی لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ جنگ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایماء پر ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک درد بھرا خط احمد شاہ ابدالیؒ کے نام تحریر کیا تھا اور مرہٹوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کے لیے دعوت دی تھی۔ حضرت شاہ صاحب سے اللہ تعالیٰ نے تجدید واحیاء دین کا کام لیا۔ ۱۷۰۳ء میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ ۱۷۶۲ء میں وفات ہوئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادوں نے جن میں سے ہر ایک آسمان علم وعمل کا آفتاب وماہتاب تھا۔ اپنے والد کی جانشینی کا حق ادا کردیا۔ "تذکرہ" کے مصنف کے بقول ہر صاحبزادہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی (آیت من آیات اللہ) تھا۔ ان صاحبزدگان کے اسماء گرامی لکھنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ ان کے کارہائے نمایاں بخوف طوالت نقل کرنے سے قاصر ہوں۔

(۱). شاہ عبدالعزیزؒ (۲). شاہ رفیع الدینؒ (۳). شاہ عبدالقادرؒ (۴). شاہ عبدالغنیؒ۔ یہ بھی بہت بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ لیکن آپکی سب سے بڑی فضیلت اور خصوصیت یہ ہے کہ آپ حضرت شاہ اسماعیلؒ شہید کے والد بزرگوار تھے جو باعتبار علم وفضل تقویٰ وطہارت ان عظیم المرتب بزرگوں میں

سے تھے جو صدیوں میں کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

غرض یہ کہ یہ صرف شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے صاحبزدگان اور تلامذہ، معتدین کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ سلطنت کے شدید ترین زوال اور پھر اس کے اختتام کے باوجود ہندوستان سے اسلام فنا نہیں ہوا ... اندلس سے مسلمانوں کی حکومت گئی جو صدیوں پر محیط تھی تو ساتھ ان کا مذہب بھی رخصت ہوگیا بہت کچھ مارے گئے اور جو بچ گئے تھے تو انہوں نے طوعاً وکرہاً عیسائی مذہب اختیار کرلیا لیکن یہاں ہندوستان کا حال یہ ہے کہ انگریزوں نے برسراقتدار آنے کے بعد یہ چاہا کہ وہ ہندوستان کو اپنا ہم مذہب بنائے۔ انہوں اس مقصد کیلئے مذہبی کتابوں کی اشاعت پر خطیر رقم صرف کی۔ پادریوں کے ذریعہ بڑی زور شور سے عیسائیت کی تبلیغ لرائی، مباحثوں اور مناظروں کا بازار ایک عرصہ تک گرم رہا۔ لیکن باایں ہمہ یہاں کے مسلمان اپنے دین پر سختی سے قائم رہے۔ استقلال اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور اندلس کی طرح ان میں ارتداد کا فتنہ عام نہیں ہوا حق یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کی جسمانی اور روحانی اولاد کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا صرف یہی کارنامہ نہ تھا کہ آپ نے وعظ وارشاد تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کے ذریعہ عقائد واعمال کی اصلاح کی بلکہ آپ نے تلوار کے ذریعہ ہندوستان میں خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت قائم کرنے کیلئے جدوجہد کی۔ اگر چہ اس جدوجہد میں آپ بلاواسطہ شریک نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعد میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اور آپ کا جہاد میدان بالاکوٹ میں ۱۸۳۱ء میں جام شہادت نوش کرنے کے بعد بھی بنگال اور سرحد میں اس تحریک کے نام کو برقرار رکھنے کے لیے مجاہدین کی ایک جماعت کا باقی رہنا اور غلبہ اسلام کیلئے کام کرتے رہنا یہ سب اس فضا کا نتیجہ تھا جو حضرت شاہ ولیؒ اللہ صاحب نے پیدا کردی تھی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ دونوں بزرگوں کے تربیت یافتہ تھے۔ علاوہ ازیں معاملات جہاد میں حضرت صاحب کے دست راست، مولانا محمد اسماعیلؒ شہید تھے، جو رشتے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب کے پوتے تھے۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے چچا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے خاص طور پر استفادہ کیا تھا اور چچا نے بھی بھتیجے کی صلاحیت اور قابلیت کو دیکھ کر کندن بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ پس اس تمام سلسلے کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو بقول حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت شاہ ولیؒ اللہ صاحب دراصل اسلامی انقلاب کی ایک عظیم الشان تحریک کے بانی تھے۔ اگرچہ حالات کی خرابی اور نزاکت کے باعث اس ملک میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوسکی۔ تاہم اس کا یہ اثر ضرور پڑا کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اس ملک میں زندہ ہیں۔ ان کی

مذہبی حالت بھی بہ نسبت دیگر ممالک اسلامیہ کے بہتر ہے۔ تمام ہندوپاک میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے اور شب وروز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو پھیلانے میں مصروف عمل ہیں بہرحال مجاہدین کا یہ قافلہ سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے حضرت سید احمدؒ، حضرت شاہ اسماعیلؒ اور ان کی رفقاء نے ۲ مئی ۱۸۳۱ء کو شہادت پائی۔

واقعہ بالاکوٹ کے بعد بھی علماء ہند کی تحریک آزادی اندر ہی اندر زور پکڑتی رہی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علماء کا قافلہ سب سے آگے تھا۔ لیکن اپنوں کی بے وفائیوں، غداریوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہوگیا تو اب انہوں نے دل کھول کر انتقامی کروائیاں شروع کر دیں۔ لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ دہلی میں جہاں کوئی مقامی باشندہ نظر آتا اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ صرف ایک دن میں چوبیس مغل شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ دلیر اور بہادر نوجوانوں کو توپ کے دہانے سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ بعض لوگوں کو سور کی کھالوں میں سی کر دریا میں پھینک دیا گیا۔ لال قلعہ کے قریب شاندار عمارتوں کو مسمار کرکے چٹیل میدان بنادیا گیا۔ دہلی کے علاوہ بھی ہر بڑے شہر میں عارضی پھانسی گھر بنائے گئے۔ سینکڑوں بلند پایہ علماء سولیوں پر لٹکائے گئے۔ لاتعداد خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ اکثر خواتین نے تحفظ ناموس کی خاطر کنوؤں میں چھلانگیں لگادیں۔ بڑے بڑے قیمتی کتب خانوں کو نذر آتش کردیا گیا۔

صاحب تاریخ دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ صرف قصبہ دیوبند میں چوالیس اشخاص کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ آم کے جس درخت پر لوگوں کو پھانسی دی گئی، اس کو راقم السطور نے بھی دیکھا ہے۔

علماء حق سے مراد وہ علما کرام ہیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی کی غلامی کو قبول نہیں کیا۔ یہ لوگ محض اصطلاحی قسم کی اسلامیات کے فاضل نہیں تھے بلکہ علوم دینیہ پر کامل دسترس کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست کے نشیب وفراز سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ پھر ان کا علم محض کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ عملی میدان میں بھی یہ دوسروں سے آگے تھے اور قائدانہ کردار ادا کررہے تھے۔ ان علماء حق نے آزادی کی تحریک میں نہ صرف کام کیا بلکہ اس تحریک کے بانی اور محرک بھی یہی لوگ تھے۔ ان لوگوں نے ہی اس تحریک کا آغاز کی۔ اور آہستہ آہستہ مسلمانوں اور دوسری اقوام کو اپنے ساتھ ملایا۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ برصغیر میں آباد مختلف اقوام کو اپنا دینی ومذہبی تشخص قائم رکھتے ہوئے اتحاد کی دعوت دی اور اس میں وہ کامیاب رہے۔

جہاد شاملی :- اہل ہند انگریز کے مظالم کے خلاف جب اٹھ کھڑے ہوئے اسی دور میں حضرت حاجی

امداد اللہ صاحب ؒ مہاجر مکی کی زیر قیادت تھانہ بھون سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا لشکر شاملی کی طرف روانہ ہوا۔ جو انگریزوں کی فوج کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اس لشکر میں حضرت مولانا قاسم صاحب ؒ نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ اور حافظ محمد ضامن صاحب ؒ (جو اسی شاملی کے میدان میں شہید ہوئے) قابل ذکر ہیں۔ یہ واقعہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو رونما ہوا جب انگریزوں کو اس کا علم ہوا کہ یہ حضرات جو اپنے زمانے کے نامور عالم اور صوفی تھے، ہمارے خلاف جہاد میں شریک ہوئے ہیں تو ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے۔ حضرت حاجی صاحب ؒ نے وطن کو خیرآباد کہہ دیا اور بہ نیت ہجرت مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد انگریزوں نے تھانہ بھون پر حملہ کرکے اسے تباہ و برباد کر ڈالا اور گھروں کو آگ لگاکر خاکستر بنادیا۔ حضرت مولانا گنگوہی ؒ ایک مسلمان کی مخبری پر رام پور سے گرفتار کیے گئے پھر ان کو سہارنپور جیل میں منتقل کردیا گیا، جہاں آپ تقریباً چھ ماہ قید رہے۔ پھر آپ کو رہا کردیا گیا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند ؒ کے جہاں باقی کمالات ہیں وہاں آپ کا عظیم کارنامہ انگریزوں کے خلاف منظم اور بھرپور جدوجہد ہے۔ جس میں تحریک ریشمی رومال سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس تلخ داستان کو اگر پڑھنا ہو تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ کی "نقش حیات" اور مولانا محمد میاں ؒ صاحب کی کتاب "تحریک شیخ الہند" پڑھیں۔ مختصر یہ کہ مولانا عبیداللہ سندھی ؒ جو حضرت شیخ الہند ؒ کے اجل تلامذہ میں سے ہیں۔ مولانا سندھی کا ایک خط جو ریشمی رومال پر لکھا گیا تھا "یار لوگوں" کے ہتھے چڑھ گیا اس کی وجہ سے تحریک کا نام تحریک ریشمی رومال پڑگیا۔ حضرت شیخ الہند ؒ ترکی کے زعماء سے مل کر لمبا پروگرام بنا چکے تھے۔ اور مالٹا جیل میں اپنے رفقاء سمیت ڈال دیئے گئے۔

ریشمی خطوط کی تحریک:- یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو، ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے اور سلطنت برطانیہ کو تباہ کردیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے کیلئے مولانا عبیداللہ سندھی ؒ نے اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔ حضرت شیخ الہند ؒ کی مساعی سے عثمانی حکومت کے چند ممتاز قائدین غازی انور پاشا اور حجاز کے گورنر غالب پاشا کی حمایت حاصل ہوگئی۔ ریشمی رومال کی تحریک کے بے نقاب ہوتے ہی حکومت برطانیہ نے برصغیر کی ان تمام ممتاز شخصیتوں کو گرفتار کرلیا جو اس تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں حضرت مولانا احمد علی ؒ کے علاوہ ان کے دونوں مرشد حضرت خلیفہ محمد ؒ دینپوری اور حضرت سید تاج محمود ؒ امروٹی بھی شامل تھے۔

حضرت شیخ الہند محمود الحسنؒ (متوفی ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء)۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ایک طرف تو ہندوستان کے ہندو مسلم باشندوں میں تحریک آزادی کی روح پھونک دی اور دوسری جانب آزاد قبائل کو جہاد کے لیے آمادہ کیا۔ ساتھ ہی حکومت افغانستان اور ترکی وغیرہ کو اپنے خاص نمائندے بھیج کر امداد کے لیے آمادہ کرلیا۔ ادھر آپ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حج کی غرض سے مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ وہاں شریف حسین نے انگریزوں کی سازش سے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی تو پھر اس نے انگریزوں کے اشارہ پر حضرت شیخ الہندؒ کے پاس دستخط کیلئے ایک فتویٰ بھجوایا جس میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی مگر آپ نے دستخط کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اس پر شریف حسین نے آپ کو اور آپ کے رفقاء کو جس میں مولانا حکیم نصرت حسینؒ، مولانا عزیر گلؒ اور مولانا حسین احمدمدنیؒ شامل تھے گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا اور مولانا حسین احمدمدنیؒ پہلے ہی گرفتار کیے جاچکے تھے۔ ان حضرات کو جہاز پر سوار کرکے مصر روانہ کردیا گیا۔

انگریز دشمنی اور نفرت:۔ حکیم نصرت حسینؒ جو شیخ الہندؒ کے ساتھیوں میں سے تھے جب حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کا وقت آیا تو آپ نے ان کی قبر پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انگریز حکام نے چند فوجی نوجوانوں کو آپ کے ہمراہ بھیجا۔ حالانکہ آپ اس وقت بہت لاغر اور کمزور ہوچکے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی آپ ان فوجیوں سے تیز تیز ان کے آگے چل رہے تھے۔ کسی ساتھی نے پوچھا کہ حضرت اس کبرسنی اور کمزوری اور بیماری کی حالت میں جب کہ آپ سے چلنا مشکل ہورہا ہے تو ان فوجیوں سے آگے کیسے چل رہے تھے؟ فرمایا میری غیرت ایمانی گوارہ نہیں کرسکی کہ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن میرے آگے آگے چلے اور میں پیچھے چلوں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق یو۔پی کے گورنر سر جیمس نے کہا تھا کہ "اس شخص کی اگر بوٹی بوٹی بھی کردی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عدوات ٹپکے گی۔"

ان حضرات میں سے ہر ایک کو کال کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ تقریباً ہر شخص کو یقین تھا کہ پھانسی کی سزا ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق اسارت مالٹا کی تجویز ہوئی۔ اسارت مالٹا کی مدت تقریباً تین سال ہے۔ اس فرصت میں حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی نے اپنے استاذ محترم کی بے نظیر خدمت انجام دی اور اپنی دیرینہ خواہش حفظ قرآن کریم کی تکمیل فرمائی۔ نیز حضرت شیخ الہندؒ صاحب جو ترجمہ قرآن مجید تحریر فرمارہے تھے اس میں آپ ان کے معاون رہے۔ پھر ۱۹۲۰ء میں ان حضرات کی رہائی ہوئی۔ اس وقت تحریک خلافت ہندستان میں زوروں پر تھی۔ اسارت مالٹا

کے زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی صحت بری طرح متاثر ہوچکی تھی اس لیے آپ اپنا ارادہ پورا نہ فرما سکے کہ ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کرکے رائے عامہ کو حصول آزادی کیلئے مزید ہموار کرتے ۔ تقریباً پانچ ماہ علیل رہ کر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر آپکا وصال ہوگیا۔اور حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کو حضرت شیخ الہندؒ کی جانشینی کا بار اٹھانا پڑا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے تاثرات کچھ یوں ہیں کہ " مولانا شیخ الہندؒ مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دور کے علماء کی آخری یادگار تھے ۔ ان کی زندگی اس دور حرمان وفقدان میں علماء حق کے اوصاف وخصائل کا بہترین نمونہ تھی ۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا وہ علماء ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے ۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ تعالیٰ کے آگے جھک چکا تھا عین جوارح حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے ۔ یہ مصیبت انہیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام وملت اسلام کی تباہی وبربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کرسکا اور انہوں نے اعداء حق کی مرضیات وہوا کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کردیا ۔"

ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند کے قبرستان میں کسی طالب علم کو دفن کرنے کیلئے لے گئے ۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کی قبر کے پاس جگہ خالی تھی تو مولانا عزیر گلؒ صاحب (اسیرمالٹا) نے یہ کہا کہ حضرت شیخ آپ کی قبر کے لیے یہ جگہ موزوں ہے ۔ اس کو اپنے لیے آپ مختص کردیں تاکہ آپ کو اپنے استاد محترم کا جوار نصیب ہوجائے ۔ حضرت شیخ الہندؒ صاحب نے فرمایا کہ یہ تو آپ کی خواہش ہے ! مجھ سے پوچھا ہوتا کہ میری کیا تمنا اور آرزو ہے ؟ فرمانے لگے کہ میری تو یہ خواہش ہے کہ میدان جہاد میں اس طرح مارا جاؤں کہ ہاتھ کہیں کٹا پڑا ہو ، سر کہیں ہو دھڑ کہیں پڑا ہو میں تو چاہتا ہوں کہ قبر کا نشان ہی نہ بنے ۔

حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب مدنی نے ہندوستان میں حضرت شیخ الہندؒ کی جاری کردہ تحریک آزادی کو مزید آگے بڑھانے میں قائدانہ کردار ادا کیا ۔ آپ کو مختلف جلسوں اور کانفرنسوں کی صدارت کے فرائض انجادم دینا پڑے ۔

مقدمہ کراچی :- کراچی میں خلافت کمیٹی کے عظیم الشان اجلاس ہوئے جن میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علیؒ بھی شریک تھے ۔ چونکہ شیخ الہندؒ کی حیات میں ترک موالات کی تحریک کا آغاز ہوچکا تھا اور تقریباً پانچ سو علماء ترک موالات کے سلسلے میں فتویٰ بھی صادر کرچکے تھے ۔ اس جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے مذکورہ اجلاسوں میں حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی نے ایک تجویز پیش فرمائی

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انگریزوں کی فوج میں ملازم رہنا ، بھرتی ہونا یا اسکی دوسروں کو ترغیب دینا حرام اور ناجائز ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جو لوگ فوج میں ملازم ہیں ان تک یہ حکم پہنچائے اور فوج سے علیحدہ ہوجانے کی ترغیب دے ۔ مولانا محمد علیؒ اور دیگر لیڈروں نے اس تجویز کی تائید کی۔ حکومت برطانیہ کی نظر میں چونکہ مذکورہ تجویز نہایت سنگین جرم تھی اس لیے مولانا حسین احمدؒ مدنی ، مولانا محمد علیؒ ، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو ، مولانا نثار احمد کانپوری ، پیر غلام مجددسندھی اور گروشنکر اچاریہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے ۔ مولانا مدنیؒ کو دارالعلوم دیوبند سے گرفتار کیا گیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو خالق دینا ہال کراچی میں مقدمہ کی کاروائی شروع ہوئی ۔ حضرت مولانا مدنیؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے بموجب

" افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر "

" سب سے افضل جہاد جابر بادشاہ کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا ہے ۔ " آپ نے بلاخوف وخطر صاف طور پر کہہ دیا۔ میں ایک مذہبی آدمی ہوں ۔ قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث پر میرا پورا اعتقاد ہے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو مذہبی فرائض ادا کرنے سے روکے تو اس روک تھام کو خاطر میں نہ لائے اور اپنے راستہ میں حائل نہ سمجھے ۔ حضرت مدنیؒ نے عدالت میں ترک موالات اور مسلمان کے قتل حرام پر ہونے قرآن مجید کی چھ آیتیں اور چوتنیس احادیث اور علم کلام کی معتبر کتابوں کے حوالے اور فقہاء کرام کے فتاویٰ پیش فرمائے ۔ اور مزید فرمایا اگر مذہبی فرائض کا لحاظ واحترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلہ کا تصفیہ کرلینا چاہیئے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے ؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کیلئے تیار ہے تو مسلمان جان تک قربان کردینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں کہ اپنی جان قربان کردوں گا ۔ یہ بات سن کر مولانا محمد علی جوہرؒ نے مولانا حسین احمدؒ مدنی کے قدم چوم لئے ۔ یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو اس تاریخی مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا ۔ اس مقدمہ میں سب کو دو دو سال کی قید سخت کی سزا سنائی گئی ۔ اس عرصہ اسارت میں مولانا محمد علی جوہرؒ نے حضرت حسین احمدؒ مدنی سے ترجمہ قرآن مجید پڑھا۔ دوسال کے بعد آپکو رہا کردیا گیا۔ رہائی کے بعد پھر تحریک آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش شروع کردی ۔ ۱۹۴۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کا آپ کو صدر منتخب کیا گیا ۔ جون ۱۹۴۲ء میں آپ کو ایک خلاف قانون تقریر کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور چھ ماہ کی قید با مشقت کی سزا دی گئی ۔ چھ ما

پورے ہونے کے بعد حکومت نے آپکو رہا نہیں کیا بلکہ غیر معینہ مدت کے لیے نظر بند کر دیا۔ پھر ۲۴ جنوری ۱۹۴۳ء میں آپ کو مراد آباد جیل سے نینی جیل مراد آباد منتقل کر دیا اور وہاں تقریباً انیس ماہ نظر بند رہے۔ دو سال دو ماہ کی یہ مدت اسارت اس وقت ختم ہوئی جبکہ ۲۶ اگست ۱۹۴۴ء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے۔

مندرجہ بالا سطور میں تحریک آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے علماء حق کے سنہری کارناموں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ داستان غم بہت طویل ہے

ع　　قصہ کوتاہ کردورنہ درد سر بسیار بود

آخر میں آزادی کی جو جنگ پاکستان کے حصول کی خاطر لڑی گئی اس میں علماء حق کی سنہری کردار کا ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکابر علماء دیوبند نے تحریک پاکستان میں نہ صرف علمی تائید کی بلکہ جدوجہد میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ جسکا اعتراف مسلم لیگ کے قائدین نے بھی کھلے دل سے کیا مسلم لیگ نے جھانسی کا پہلا الیکشن کانگریس سے علیحدہ ہو کر لڑا اور اسکی تائید وحمایت حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اور انکے ہزاروں معتقدین علماء فضلاء اور مریدوں نے کی جھانسی کا الیکشن جیتنے کے بعد مولانا شوکت علی مرحوم اور دوسرے عمائدین مسلم لیگ شکریہ ادا کرنے کیلئے حضرت کے پاس تشریف لائے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں آلہ آباد کے جلسہ میں خطبہ صدارت میں اسلامی سلطنت کا تخیل پیش کیا۔ بقول مفسر قرآن عبدالماجد دریاآبادیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۹۲۸ء میں اسلامی سلطنت کا تخیل اپنی مجلس میں تفصیل کیساتھ پیش کر چکے تھے۔

۴۶۔ ۱۹۴۵ء کے قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں اکابرین ملت علماء ومشائخ کی معیت میں نظریہ پاکستان کی تائید کی اور جگہ جگہ اجتماعات میں صدارتی خطبے پڑھے جو ابتک طبع شدہ ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا خطبہ بعنوان "ہمارا پاکستان" خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے۔ ان جید علماء کی جہد مسلسل کے نتیجہ میں عوام نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ اس کامیابی کو کسی فرد یا کسی ایک جماعت کی کامیابی تصور کرنا حقیقت شناسی سے بعید ہے۔ ان انتخابات میں کامیابی کے بعد صوبہ بنگال میں ریفرنڈم کا ڈھونگ کھڑا کیا گیا۔ سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی وہاں پختونستان کا نعرہ بلند ہوا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ صوبہ سرحد کے پاکستان میں شامل ہونے یا نہ ہونے پر استصواب کیا جائے اس اہم اور نازک بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ سلجھانے کیلئے علامہ عثمانیؒ

نے سرحد کا طوفانی دورہ کیا۔ آپ نے پشاور، بنوں، کوہاٹ، مردان، ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ، سوات، آزاد قبائل اور دیگر علاقوں کے دورے فرمائے۔ علامہ عثمانیؒ کی مدلل سحرانگیز تقاریر نے سرحد کے مسلمانوں کی پایپلٹ دی۔ اور سرحد کے غیور عوام نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے دیا۔ اس سفر میں علامہ عثمانیؒ کے ساتھ مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا شمس الحق افغانیؒ بھی تھے۔ کامیاب دورے کے بعد علامہؒ کراچی واپس آئے تو بابائے قوم مسٹر جناحؒ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے علامہؒ کو مبارک باد دی اور کہا کہ آپ کے ایمان افروز خطابات نے لوگوں میں مذہب کی روح پھونک دی۔ اسی طرح بنگال کے ریفرنڈم میں علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے بھر پور حصہ لیا اور قریہ قریہ، بستی بستی، گاؤں گاؤں خود تشریف لے گئے اور کہا کہ ہم الگ خطہ اس لیے قائم کرنا چاہتے ہیں، تاکہ یہاں قرآنی دستور کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ سحرانگیز خطبات اور وقیع دلائل نے بنگال کے عوام کو ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور کردیا۔ علامہ ظفراحمد عثمانیؒ کے ساتھ اس دورے میں مولانا اطہر علیؒ اور مولانا محمد سہول عثمانیؒ جیسے حضرات بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اکابر علماء کی محنت شاقہ کے نتیجہ میں سرحد اور بنگال پاکستان کا حصہ بن گئے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف عام وخاص کو تھا یہی وجہ ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں جھنڈا لہرانے کا اعزاز ان دو حضرات کے نصیب میں آتا ہے۔ یہ بات لکھتے ہوئے میرا قلم کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا جھنڈا لہرانے کا اعزاز کسی آکسفورڈ، کیمرج اور کیلفورنیا یونیورسٹیز کے فارغ شدگان کے حصہ میں نہ آیا بلکہ یہ اعزاز دیوبند کے ان فضلاء کو ملا جنھوں نے تحریک پاکستان میں شبانہ روز محنت کرکے اپنی علمیت اور قابلیت کا لوہا منوایا۔

ایک موقع پر بمبئی میں بابائے قوم مسٹر جناحؒ نے دیوبند کی ایک عظیم ہستی حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو خراج تحسین ان الفاظ میں پیش کیا اور کہا کہ:

مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم تقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور تمام علماء کا علم اور تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو اس ہستی کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں۔ وہ چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو آپ جیسی عظیم المرتب ہستی کی حمایت کافی ہے۔

قیام پاکستان کا اصل محرک اسلام کے فروغ وسربلندی کا جذبہ تھا۔ تحریک پاکستان کے موقع

پر جن مسلمانوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا ان کے ذہن میں اسلام کے سوا کوئی اور منزل مقصود نہ تھی۔ پاکستان بنتے وقت اس خطۂ زمین کیلئے جو قربانیاں دی گئیں وہ صرف اسلام کیلئے تھیں۔ پاکستان کے قیام کا مقصد صرف اور صرف "اسلامی مملکت" قیام تھا جو اس کے نعرے سے بالکل واضح تھا اور ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)"

بابائے ملت مسٹر جناح نے اگست ۱۹۴۴ء میں گاندھی کے نام جو خط لکھا تھا اس میں صاف صاف کہا کہ "قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے اس میں مذہبی مجلس دیوانی فوجداری، عسکری، تعزیری معاشرتی، معاشی غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لیکر روزانہ کے امور حیات تک، روح کی نجات سے لیکر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لیکر فرد کے حقوق وفرائض تک دینوی زندگی میں جزا وسزا سے لیکر عقبیٰ کی جزا وسزا تک ہر فعل وقول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں تو حیات وما بعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں"۔

۱۹۴۵ء میں ایک پیغام میں مسٹر جناح نے کہا تھا کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات واخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین وایمان اور قانون حیات ہے۔ یہ ہمارے مذہبی، معاشرتی، تجارتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اللہ کا حکم ہے کہ ہر مسلمان کے پاس اللہ کے کلام کا نسخہ ضرور ہو اور وہ اس کو بغور وخوض پڑھے تاکہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہدایت کا باعث بنے۔ ایک طرف پاکستان کا مطلب کیا؟ "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا نعرہ اور دوسری طرف یہ مقامات تھے جس کے حصول کیلئے مسلمانوں نے تن من دھن سب کو قربان کردیا۔ بدقسمتی سے ۵۰ برس پورے ہونے کے باوجود اس مملکت خداداد پاکستان میں اسلام کا نفاذ عملی طور پر نہ ہوسکا۔ اسی وجہ سے پاکستان کا بڑا حصہ مشرقی پاکستان ہم سے کٹ گیا جو اب بنگلہ دیش کہلارہا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا

جسطرح علماء دیوبند نے تحریک پاکستان میں بھرپور اور کلیدی کردار ادا، اسی طرح "تعمیر پاکستان" میں اور جن عظیم مقاصد کیلئے پاکستان حاصل کیا گیا یعنی اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے بھی ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیئے۔ اس وقت اجمالی خاکہ ہی پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔

" ۱۹۴۹ء میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے قرارداد مقاصد تیار کی۔ وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان نے

منظور کرایا۔ اس قرارداد سے پاکستان کا رخ اسلامی نظام کی طرف ہوا ، اور اس مملکت خداداد پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے والوں کے خواب چکنا چور ہوگئے۔ ۱۹۴۹ء میں علامہ سید سلیمان ندوی ، مولانا محمد شفیع اور ڈاکٹر حمید اللہ پر مشتمل تعلیمات اسلامی بورڈ قائم ہوا جو اپریل ۱۹۴۵ء تک تقریباً ساڑھے چار سال تک کام کرتا رہا۔ بورڈ کی سفارشات ارباب اقتدار کی نظر میں پسندیدہ قرار نہ پائیں بلکہ شاید ان کی طبع نازک پر گراں گذری ہوں۔ اس لئے انکو عوام میں روشناس نہیں کرایا گیا، انہیں سردخانہ میں ہی رکھ دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں خطیب پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی دعوت پر ہر مکتبہ فکر کے اکابر او مشائخ عظام کے اجتماع میں اسلام کے نفاذ کیلئے ۲۲ اصول مرتب کئے گئے جو امت کی وحدت اور ملک میں اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کے ضامن تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے زور دینے پر ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس میں جسٹس رشید احمد جسٹس میمن ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کئے گئے ، اور علماء کی وجہ سے صرف علامہ سید سلیمان ندوی کو ممبر بنایا گیا۔ مگر انکے اصرار پر مولانا مفتی محمد شفیع کو بھی کمیشن کا رکن بنادیا گیا۔ یہ کمیشن دوسال تک کام کرتا رہا لیکن وزارتوں کے تغیروتبدل اور برسر اقتدار طبقوں کے بعض افراد کی مسلسل رکاوٹوں کے باعث مساعی رکاوٹوں کے باعث جو اس ملک میں اسلامی نظام دیکھنے کے روادار تھے اس کمیشن کی مساعی اسلامی نظام کے سلسلہ میں نتیجہ پیدا نہ کرسکی

تاریخ پر اگر طائرانہ نظر ڈالیں تو ہر تحریک کا ہراول دستہ اکابرین علماء دیوبند نظر آتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت یا عائلی قوانین کے خلاف نعرہ حق ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہویا شریعت کے نفاذ کیلئے ایوانوں میں یا ایوانوں سے باہر قلندرانہ آواز تو میدان عمل میں حضرت مولانا سید انور شاہ کاشمیری ، حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، حضرت مولانا احمد علی لاہوری ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ، حضرت مولانا محمد علی جالندھری ، حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی ، حضرت مولانا عبداللہ درخواستی ، حضرت مولانا مفتی محمود ، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی ، حضرت مولانا عبدالحق ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری ، حضرت مولانا لال حسین اختر ، حضرت مولانا محمد حیات اور دیگر اکابر جلوہ افروز نظر آتی ہیں۔ ان شخصیات نے ہمیشہ حق کے پرچم کو بلند رکھا اور باطل قوتوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔ ان تحریکوں میں دیگر مسالک کے علماء حضرت مولانا ابوالحسنات قادری ، حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی ، حضرت مولانا داؤد غزنوی ، حضرت کفایت حسین ، سید مظفر علی شمسی اور دیگر اکابر کے شانہ بشانہ شریک رہے ہیں۔

جناب مولانا الطاف الرحمن صاحب (فاضل جامعہ حقانیہ)
استاد الحدیث جامعہ امداد العلوم پشاور صدر

پاکستان جن مقاصد کیلئے وجود میں آیا تھا کیا وہ مقاصد حاصل ہوئے؟

کوئی بھی سچا مسلمان مکمل اسلامی طریقہ زندگی اپنائے بغیر پوری طرح سے مطمئن ہرگز نہیں ہوسکتا۔ لیکن اسلامی طریقہ حیات کو اس کی پوری روح کے ساتھ اپنانے کیلئے جس مناسب اور موزوں ماحول کی ضرورت ہے وہ ایک مخلص اور حوصلہ مند اسلامی حکومت اور اقتدار کی فعلیت کے بغیر قطعاً میّسر نہیں آسکتا۔ گو اسلامی طریقہ زندگی مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی وظائف کی بجا آوری کے مجموعے سے تشکیل پاتی ہے اور ان دونوں کا اس کی ھیئت اور صورت گری میں برابر کی حصہ داری ہوتی ہے۔ تاہم اس کے مخصوص عالمی کردار کا زیادہ تر انحصار مسلمانوں کی اجتماعی اور قومی وملی کارکردگی ہی پر ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی خیریت وفوقیت کے قابل صد فخر اعزاز کے اعلان کے موقعہ پر افراد کی بجائے اس کی ہئیت اجتماعی یعنی امت کو لائق خطاب ٹھہرایا گیا چنانچہ ارشاد ہوا۔

"کنتم خیر امتہ اخرجت للناس"

بلاشبہ اس معجز خطاب الہیٰ میں اس گہری اور عمیق حقیقت پر آگاہی بخشی گئی کہ مسلمانوں کا تو اخراج (تکوین وپیدائش) ہی محض ایک بے ربط وبے ضبط ھجوم مومنین کی طرح نہیں۔ بلکہ ظاہری وباطنی ربط وھم آہنگی سے متصف ایک مضبوط وتوانا امت وجماعت کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ویسے تو کوئی بھی نظریہ محض نظریئے کی حد تک بھی اپنی ترویج اور بڑے پیمانے پر نشرواشاعت کے لئے لازمی طور پر کسی جمعیت یا جماعت کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن خاص طور پر جب اس نظریئے کی بنیاد پر عملاً ایک پورا نظام حیات برپا کرنا پیش نظر ہو پھر تو ایک مضبوط اجتماعیت کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کی آمد اور پھر رفتہ رفتہ پوری طرح سے یہاں کے اختیار واقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد اس دیس میں مسلمانوں کی حیثیت اس ڈور کٹے

پتنگ یا شکستہ کشتی سے کسی طرح بھی زائد اور متجاوز نہ تھی جو ہوا کے منہ زور جھکڑوں یا سمندر کی تیز وتند طوفانی موجوں میں محصور اپنے مہیب انجام کے تصور سے لرزہ براندام ہو۔

ہر چند کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی رفعتیں پیوند خاک ہوگئی تھیں اور اسکی عظمت رفتہ کے ملبے کے انباروں پر کسی نئی تعمیر کی امیدیں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ تاہم اس بجھے ہوئے خاکستر میں کہیں کہیں پوشیدہ چنگاریاں بھڑک اٹھنے کی آس چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہورہی تھیں انہیں چنگاریوں میں نسبتاً ایک زیادہ روشن چنگاری دھلی کا ولی اللھی خاندان تھا، جس کے اصاغر واکابر کے مشنری جذبوں اور رویوں نے ہندی مسلمانوں کی بیداری میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی خاندان کا فیض اثر تھا۔ جس کے نتیجے میں اولاً تحریک شہیدین اور جنگ آزادی کے عسکری مہمات اور ثانیا دارالعلوم دیوبند کے علمی غلغلوں سے پورے کا پورا برصغیر گونج اٹھا تھا۔

باشندگان ہند کی طویل اور مسلسل مساعی کے نتیجے میں جب صبح آزادی کا طلوع ہونا یقینی نظر آنے لگا تو مستقبل کے بارے میں ہندی مسلمانوں کی دو جماعتیں وجود میں آگئیں۔ جن میں سے ایک کا خیال یہ تھا کہ مسلمان تصور حیات سے لے کر تشکیل حیات کے ایک ایک جزئیے میں ہندوں سے الگ تھلگ ایک مستقل اکائی ہے۔ چنانچہ ہندوں کے ساتھ لگے رہنے میں ان کا اپنے ان ملی، منصبی بین الاقوامی اہداف کے لئے کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، جن کا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض وغایت کے بیان کے سلسلے میں

" لیظہرہ علی الدین کلہ " کے پرشکوہ الفاظ میں اظہار واعلان فرمایا ہے اور جس کی مزید وضاحت کیلئے نبی علیہ السلام کا یہ پر جلال ارشاد موجود ہے۔ " الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ " اور جس کا حاصل یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پورے عالم میں عملاً وجود کفر کو تو نہ صرف برداشت کرسکتی ہے بلکہ اس کے تمام شہری اور معاشرتی حقوق کی مکمل رکھوالی اور نگہداشت کا ذمہ بھی اٹھاتی ہے۔ لیکن شوکت کفر کو ایک لحہ کیلئے بھی گوارا نہیں کرسکتی، جدید اصطلاح میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ملت اسلامیہ پوری انسانی دنیا اور اس کے ایک ایک قریہ اور بستی پر اسلام کی سیاسی بالادستی قائم کئے بغیر کسی بھی قیمت پر اپنی تبلیغی اور جہادی مہمات سے باز نہیں رہ سکتی، اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں بیان فرمایا:

الجہاد ماضٍ الی یوم القیامۃ حتی یقاتل آخر ھذہ الامۃ الدجال

اور اسی مفہوم کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ علامہ نے اس شعر میں:

تانیاید بانگ حق از عالمے گر مسلمانے نیاسائی دمے

قرآن وحدیث کی انہی تصریحات کی کوکھ سے برآمد ہونے والے ولولوں نے تحریک پاکستان کی شکل اختیار کی، جس کی ہندی مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے سنہری خوابوں کی تعبیر سمجھ کر اپنی بے مثال مالی اور جانی قربانیوں سے آبیاری کی۔

مسلمانان ہند کی ایک دوسری جماعت اسلام کے عالمی تصور اور مسلمانوں کے ملی منصبی ذمہ داریوں کے کماحقہ احساس میں اول الذکر جماعت کے ساتھ مکمل اشتراک واتفاق اور نظری و علمی ہم آہنگی کے باوصف تحریک پاکستان کی موجودالوقت ہیئت کذائی اور بالخصوص اس کے صف اول کی قیادت سے نہ صرف بدگمان بلکہ دینی نقطہ نظر سے سخت بیزار تھی۔ اس جماعت کے اکثر اہل حل وعقد کا اندازہ تھا کہ اس قماش کی قیادت نہ صرف یہ کہ اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام کے نعرے میں مخلص نہیں بلکہ اپنی فطرت اور نہاد کے اعتبار سے وہ اس کے قابل بھی نہیں، پھر انکے اس موقف کی تائید تحریک پاکستان کے بعض نہایت ذمہ دار مرکزی قائدین کے ان بیانات سے بھی ہوتی تھی جن میں صراحت کی ساتھ ذکر کیا جاتا تھا کہ مجوزہ پاکستان جدید دور کا ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا، جسمیں غیر مسلم اقلیتوں کو پارلیمنٹ تک ہی نمائندگی حاصل ہوگی اور ظاہر ہے کہ یہ کسی اسلامی مملکت کا نہیں بلکہ ایک سیکولر حکومت کا نقشہ ہوسکتا ہے۔ اس جماعت کے علمبرداروں کا یہ بھی خیال تھا کہ تقسیم ہند انگریزوں کی سازش ہے اور تحریک پاکستان کے قائدین شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سازش کی کامیابی کیلئے انگریزوں کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ انگریز اس سازشی منصوبے کے ذریعے برصغیر میں ہندؤں اور مسلمانوں کی دو الگ سیاسی اکائیاں قائم کرکے ان کو ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ لڑوانا چاہتے ہیں تاکہ مستقبل کا کوئی ایسا متحدہ ہندوستان وجود میں نہ آسکے جو براعظم ایشیامیں برطانوی ایمپائر کے مفادات کیلئے کوئی چیلنج بن سکے۔ بہرحال خود ہی مسلمانوں کے درمیان اس شدید نظریاتی تصادم کے باوجود "پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ" کی پرکیف جذباتی نعروں کی انگیخت سے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کی عظیم اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پر ابھری اور ایک بہت طویل، جانگسل اور صبر آزما دور مصائب سے گزر کر ملت اسلامیہ ہندیہ نے اپنی ہزاروں پاک اور مقدس آرزؤں کی سرزمین میں ایک نئی تاریخی عہد کا آغاز کیا۔

برصغیر کے چپے چپے پر پھیلی ہوئی ہندو قومیت کے نظریہ اکھنڈ بھارت اور خود ہی مسلمانوں کی ایک مؤثر قوت کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان کا قیام ایک معجزے سے ہرگز کم نہ تھا اور حالات سے خبردار کوئی منصف مزاج انسان اس حقیقت سے انکار کی جرات نہیں کرسکتا کہ یہ معجزہ اسلام

کے نام پر اور اسی کی برکت سے رونما ہوا لیکن خود مجھے ذاتی طور پر اور اس شخص کو جو میری طرح قیام پاکستان کے بعد ابتدائی حالات وواقعات کا براہ راست مشاہدہ نہ کرچکا ہو، اس انتہائی نامعقول صورتحال پر سخت تعجب اور افسوس لاحق ہوجاتا ہے کہ اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی ایمان پرور روایات وحکایات کی روشنی میں، تحریک پاکستان کے اس پاک صاف اور تروتازہ وتندرست تخم سے یہ ہمارا آج کا کریہہ المنظر اور بدذائقہ کڑوا کسیلا پاکستانی درخت کسطرح نمودار ہوا، کیا انبات واستاج کے مسلمہ خدائی ضابطوں میں کوئی تغیر وتبدل واقع ہوا کلاوحاشا۔

نئی نسل کے حق میں تو بعینہ اس کی مثال اس اولاد کی سی ہے جن کے والد نے ان کو انتہائی پرامید خوشخبری اور بشارت کے انداز میں بتلایا تھا کہ میں نے فلاں مقام پر ایک اچھے خاصے وسیع رقبۂ زمین پر نہایت عمدہ اور لذیذ قسم کے مختلف پھلوں کی پنیری جمائی ہے اور اسکی خدمت اور نگہداشت کیلئے اس کو ایک بہت مستعد عملے کے حوالے کیا ہے تم میرے بعد وہاں جاکر اس جنت نظیر باغ کے سایوں اور پھلوں سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور آس پاس کے لوگوں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کے مواقع بہم پہنچاؤ، لیکن جب والد کے انتقال کے بعد یہ بدقسمت اولاد وہاں پہنچی تو اچانک معلوم ہوا کہ اولاً تو عملے کی سھل انگاری اور کام چوری کی وجہ سے درخت ہی بانجھ نکلے جن میں پھل پھول نکل آنے کی صلاحیت ہی نہ تھی پھر اس پر مستزاد یہ کہ عملے نے کانٹ چھانٹ اور خراش تراش کے بہانے سے رفتہ رفتہ درختوں ہی کو بیچ کھایا اور اب وہاں پر خود رو پودوں کا ایک بھدا سا جنگل ایستادہ ہے اور حوصلہ مند عملہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا بالآخر اس کو بھی کاٹ کھانے کی چند روزہ مہلت انتظار کے بعد یہاں سے بھاگ نکلنے کے پروگرام کو آخری شکل دے رہا ہے۔

یہی شیخ حرم ہے جو چراکر بیچ کھاتا ہے گلیم بوذرؓ ودلق اویسؒ وچادر زہراؓ

قیام پاکستان کے بعد اس کی زمام کار انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں رہی جنکی برطانوی آقاؤں کے ہاتھوں برین واشنگ کے ذریعے قلب ماہیت ہوچکی تھی، چنانچہ وہ بقول لارڈ میکالے شکل وصورت سے ہندوستانی لیکن ذہن ودماغ سے ٹھیٹھ فرنگی تھے۔ یہ فرنگی زادے اولاً تو دینی نقطہ نظر سے ہمارے قومی اہداف اور ترجیحات سے ہی ناآشنائے محض تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ ملت اسلامیہ پاکستانیہ کو اسلامی سانچے میں ڈالنے کے بجائے انگریزی سانچے میں ڈھلنے سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور ثانیاً اگر سیاسی ضرورتوں کے بموجب اسلامی اہداف و ترجیحات کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کر بھی لیتے تو ساری مادی دنیا کے مادی سمت پر یکطرفہ ٹریفک کے برعکس ملک کو اسلام کی اخلاقی اور روحانی سمت پر چلانے کیلئے جس زوردار اندرونی ایمانی داعیئے اور ہمت وحوصلہ کی حاجت وضرورت

تھی وہ ان میں کہاں تھا۔ الغرض ابتدائے کار ہی سے داخلی اور خارجی ملکی امور و معاملات سے نبٹنے کیلئے غیر اسلامی رویئے برتے جانے لگے اور اس بات کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کی گئی کہ پاکستان انسانی دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو خالص اسلام کے نام پر بنا ہے۔ لہذا اس سے متعلق ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں " شان اسلام " کی جھلک موجود ہونی چاہئیے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی اس کے روز اول سے لیکر آج تک عالمی طاقتوں کے زیر اثر رہی اور پچاس سال کے طویل عرصے میں شاید اس کو آزادی کا ایک سانس بھی نصیب نہیں ہوا ہے۔ دنیا کے ربع معمورۃ میں ہر طرف آباد مظلوم مسلمانوں کے بارے میں پاکستانی حکومت نے کوئی قابل رشک کردار ادا نہیں کیا اور تو اور خود اپنی شہ رگ کشمیر اور وہاں کے مسلمانوں کی حالت زار پر یہاں کی کسی حکومت نے، مگر مچھ کا رونا رونے کے علاوہ، واقعی اسلامی اخوت و ہمدردی کا ایک قطرہ آنسو بھی نہیں ٹپکایا، بھارتی مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے اس کا اندازہ سیاسی اور معاشی جبر و ستم کے بے شمار واقعات کے علاوہ مذہبی مداخلت اور جارحیت کے اس ایک واقعہ سے .بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح سیکولرازم پر مبنی آئین رکھنے والی بھارتی مملکت میں، رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ دن کے اجالے میں لاکھوں ہندوؤں نے مسلمانوں کی قدیم عبادت گاہ بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ .بجادی اور وہاں کی حکومت نے نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کو اس خلاف آئین کاروائی سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی بھرپور سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی اور وہاں کے مسلمانوں کو آخری دم تک زبانی کلامی طفل تسلیوں سے خوش فہمی میں رکھ کر اپنے خود حفاظتی اقدامت سے بھی روکے رکھا۔ اس تاریخی دلگداز سانحے کو ہماری بے غیرت و بے حمیت حکومتوں نے جس بے حسی کے ساتھ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا اس نے تو یک لخت ہماری قومی رسوائیوں کو عالم آشکارا کردیا اور یہ کہنا سو فیصد درست رہا ہے کہ

ع حمیت نام تھی جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اور اب تو ماشاء اللہ ہماری نئی حکومت بڑی پارسا بن کر ہمارے دینی تصلب اور غیرت و حمیت کو آخری دھچکا دینے کیلئے ہمیں ان برہمن زادوں کے ساتھ صلح و آشتی اور تجارتی تعلقات استوار کرنے پر مجبور کررہی ہے جو تقسیم ھند کے بعد سے اب تک ایک لمحے کیلئے ہمیں مغلوب کرنے اور ذلیل کرنے کی فکر سے خالی ہوکر نہیں بیٹھے۔

واہ! ملک کی اقتصادی اور معاشی ابتری کو سنبھالا دینے کیلئے ہمارے حکمرانوں نے کیا سبز باغ دکھانے شروع کیے وہ بنئے، جو سرحد پار سے ثقافتی یلغار کرکے تمھاری اخلاقی بنیادیں پہلے ہی سے ہلا رہے ہیں۔

وہ تجارت کے نام پر اندر آکر تمھیں ڈاسنامائٹ کر کے رکھ چھوڑیں گے۔ بلاشبہ مرد مؤمن بصیرت کی آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جس کو دوسرے لوگ بعد میں بمشکل بصارت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، لیکن اے حکمرانو! تم نے کفر کا آلہ کار بن کر پورے ملک میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے بے تحاشا عریانی، فحاشی اور بے حیائی کی ترویج سے ہماری دینی اور ایمانی بصیرت کو ملاؤف کرنے میں کسر ہی کیا چھوڑی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے، ایمل کانسی کی گرفتاری پر بعض سیاستدانوں کے ایسے تبصروں پر کہ اس سے ہماری قومی غیرت اور وقار کو بٹالگا ہے۔ ان بھلے مانسوں کی ایسی باتیں سن کر مجھے بڑی شدومد کے ساتھ وہ حکایت یاد آجاتی ہے کہ کسی مغربی انشور کو محرم کے دنوں میں کسی شیعہ آبادی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں شیعوں کو اپنے ہاتھوں آپ ہی مارپیٹ دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کیوں ایسا کررہے ہیں کسی نے بتایا کہ شہادت حسین پر ماتم کررہے ہیں، تعجب کے ساتھ بڑے معصومانہ انداز میں کہنے لگا کہ کیا ان کو شہادت حسینؓ کی اب خبر ہوئی۔ نظریہ پاکستان کی رو سے ہمارے قومی وسائل کو ہمارے دینی اقدار وروایات کے احیاء پر صرف کرنا از خود طے تھا لیکن ہمارے حکمران اس کو ہماری تہذیب وتمدن کی ایک ایک نشانی کو کھرچ کھرچ کر مٹانے پر پانی کی طرح بہا رہے ہیں

امریکہ کے ہاتھوں ایمل کانسی کا اغواء ایک پاکستانی فرد کا اغواء ہے۔ اس سے ایک فرد کے جسمانی اغواء پر تو تم کو حقیقی یا جعلی اور بناوٹی اذیت محسوس ہوئی ہے لیکن اپنوں کے اشتراک عمل سے اس امریکہ اور دوسری دشمن قوتوں کے ہاتھوں ہماری نوجوان نسل کا جو بہت بڑے پیمانے پر اخلاقی اور فکری اضلال واغواء کا عمل کئی سالوں سے جاری ہے اس پر تمھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی ہے۔ تم ایک ایمل کانسی کو رو رہے ہو لیکن تمھارے ملک کے بہت بڑے بڑے منصوبے جن پر نہ صرف دینی اور اخلاقی لحاظ سے ہمارا مستقبل منحصر ہے بلکہ سیاسی اور معاشی لحاظ سے بھی ہمارے لئے ناگزیر ہیں۔ کافروں کی سرخ جھنڈی دکھانے سے سالہا سال سے تعویق والتواء کا شکار ہیں۔ اقتدار کے لئے حکمرانوں کی باہمی رسہ کشیوں اور جنگ زرگری نے ہمیں آدھے ملک سے محروم کردیا ہے اور اب حالات کے آئینے میں صاف دکھائی دے رہا ہے کہ اگر جلد ہی اسلامی انقلاب نہ آیا تو بقیہ آدھا ملک بھی کرسی کی بھوک کے بھینٹ چڑھنے والا ہے۔ فواحسرتاہ! پاکستانی مسلمان ان بازیگروں کے اسلامی ناموں اور اسلامی نعروں سے کتنی دفعہ دھوکہ کھا چکے ہیں اور تاہنوز منافقت اور دھوکہ بازی کے گرداں سے نکلنے نہیں پائے ہیں۔

پاکستان کی داخلی صورت حال کا ایک سرسری جائزہ بھی یہ حقیقت پانے کیلئے بالکل ہی کافی ہوجاتا ہے کہ نصف صدی گزرنے کے باوجود ہمیں اسلامی حکومت کے اولین ثمرات اور بدیہی نتائج

بھی دیکھنے نصیب نہیں ہوئے ہیں۔ عوام کی بنیادی ضروریات کی کفالت، ملک میں امن وامان کا قیام، عدالتی انصاف اور ہر شہری کو احساس تحفظ دلانا اسلامی حکومت کی تو کیا ایک عام فلاحی حکومت کی بھی اولین ذمہ داری ہے۔ پاکستان میں روزاول سے جو سیاسی اور معاشی ڈھانچہ قائم ہے اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی محروم القسمت اکثریت نان شبینہ کیلئے ترس رہی ہے۔ اور ایک نہایت چھوٹی سی اقلیت خدمت کے نام پر ملکی وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہے۔ کمر توڑ مہنگائی نے لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے اور ہمارے بالائی طبقے طوائفوں اور رقاصاؤں کیلئے وسیع وعریض ثقافتی مراکز، ملکی وغیر ملکی کھلاڑیوں کے کھیلنے کیلئے بلند وبالا اسٹیڈیموں اور فلمی صنعت کی ترقی کے لئے بڑے بڑے تھیٹروں اور کئی کئی منزلہ سینما ہالوں کی تعمیر وآرائش پر اربوں کھربوں روپے صرف کر رہے ہیں۔ گذشتہ سال ۱۹۹۶ء کے ایک اخباری کالم میں پڑھا تھا کہ آئندہ سال ۱۹۹۷ء میں پاکستان کے اربوں روپے کے صرفے پر "انٹرنیشنل اسلامک وومن گیمز" کے نام سے اسلام آباد میں تمام اسلامی ملکوں کی مغرب زدہ خواتین کے کھیلوں کا انعقاد ہو رہا ہے۔ جس کے لئے ابتدائی تیاریوں اور مشقوں پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوا۔ ان حقائق کے پیش نظر کیا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کا مسلمان بھی کسی کے ہزار باور کرانے پر بھی یہ باور کرنے کیلئے تیار ہو سکتا ہے کہ پاکستان جن اغراض کیلئے بنا تھا ان کا حصول تو کجا ان کی طرف کوئی ایک آدھ قدم بھی بڑھنے پایا ہے۔

ملک کا چپہ چپہ بدامنی کے جس آگ میں جل رہا ہے اہل وطن کو اس کی بذات خود بہت صاف وصریح مشاہدہ اور تجربہ ہو رہا ہے، چنانچہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کی رو سے اس کی تفصیلات بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امن وامان قائم کرنے والے ادارے نہ صرف یہ کہ امن وامان قائم کرنے میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ ہر طرح کی بدامنی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار اور ذمہ دار، غنڈوں، چوروں اور ڈاکوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اور بھاری مینڈیٹ حاصل کرنے والی حکومت نہ صرف یہ کہ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی، بلکہ بھیگی بلی بن کر درپردہ انکی خوشامد اور دلجوئی کر رہی ہے۔

ملک بدترین طبقاتی اونچ نیچ اور امتیازات کا شکار ہے۔ اور سیاسی ومعاشی قوت ورسوخ سے تہی دست غریب طبقہ ناقابل یقین حد تک پھس رہا ہے۔ دولت وثروت کی بنیاد پر ہندوانہ ذات پات کا تفریقی فلسفہ اپنی تمام تر قباحتوں کے ساتھ پوری طرح رائج ہے اور ہر طرف "پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات" کی کارفرمائی ہے۔ مال وجان کی بے اعتدالیوں سے داغ داغ اور چور چور معاشرہ بڑی مشکل سے اپنے سانسوں کا تسلسل قائم کئے ہوئے ہے۔ اندریں حالات یہ کہنا کس حد تک صحیح

اور درست ہوسکتا ہے کہ موجودہ حکومت ہماری قومی زندگی کے پچاس سال پورے ہونے پر "گولڈن جوبلی تقریبات" منانے میں حق بجانب ہے۔ ہمارے لئے تقریبات منانے کا نہیں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

وائے نادانی متاع کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

تحریک پاکستان میں قربانیاں دینے والوں نے تو علامہ اقبالؒ کے اس سوال واستفسار پر کہ

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت　　فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

شکم کے مقابلے میں دل کی آبادی اور آزادی کو ترجیح دے کر پاکستان بنایا تھا لیکن نا عاقبت اندیش ہوس پرست حکمرانوں کی بدولت یہاں تو نہ دل کی آزادی نصیب ہوئی اور نہ ہی شکم سیری۔ چنانچہ ہم قومی پیمانے پر "نہ خداہی ملا نہ وصال صنم" کا بہت صحیح صحیح مصداق ٹھہرے۔

سردست تو ہمارے موجودہ حالات کے پیش نظر ایمان واسلام کی بات ہی الگ رہی کہ اس کام کیلئے جس قومی وقار، خودداری اور اولوالعزمی کی ضرورت ہے وہ ایک قصہ پارینہ بن گئی ہے۔ اب تو مسئلہ درپیش ہے ہمارے سیاسی وجود وبقاء کا، ہمارے قومی بدن کا ایک ایک بال دشمنوں کے سودی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ جس کی بدولت ہمارا اختیار واقتدار عالمی مالیاتی اداروں کے ہاں گروی پڑا ہے۔ سادگی اور جفا کشی کی زندگی سے منہ موڑنے والی اور قرض لے لے کر داد عیش دینے والی قوموں کیلئے خدائی تقدیریں غلامی کے سوا کچھ نہیں۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو　　کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

ہمارے نزدیک اس تمام تر تباہی وبربادی کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کو اسلام کے لئے بنایا تھا لیکن اسمیں حقیقی اسلامی عملداری قائم نہ کی اور یہ ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہی نہیں کی جاسکتی تھی جو اسلام کے بنیاد پرستانہ تصور سے عاری ہوں اور اب بھی جب تک تبدیلی قیادت کا عمل کارفرما نہ ہو اور زمام کار ان لوگوں کے حوالے نہ ہو جو اسلام کے "اظہار علی الدین کلہ" کے تصور سے سرشار ہوں بات ہرگز بنتی نظر نہیں آتی۔ خدا کرے نصف صدی کی طویل اور عبث بادیہ پیمائیوں کے بعد پوری قوم اور بالخصوص دینی جماعتوں کی سمجھ میں یہ بات آئے کہ اب انہوں نے کسی کے سہارے کے بغیر خود اپنے ہی بل پر ایک نئے اسلامی پاکستان کی تعمیر کرنا ہے۔ خلوص اور جدوجہد ہو تو اللہ کی نصرتیں آگے بڑھنے کے لئے بے تاب ہیں۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

جناب محمد یونس میئو صاحب
لیکچرار اسلامیات (ڈسکہ)

کیا پاکستان میں مغربی جمہوریت کا تجربہ کامیاب رہا؟

قبل ازیں کہ وطن عزیز میں مغربی جمہوریت کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب حکومت کے بارے میں چند معلومات کا اعادہ کرلیا جائے۔

جمہوریت لفظ تو عربی زبان کا ہے لیکن عربی سے زیادہ اب اردو میں مستعمل ہے۔ یہ ایک طرز حکومت ہے جسے عام طور پر آمریت کی ضد قرار دیا گیا ہے۔ مولانا حنیف ندوی اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جمہوریت یونانی لفظ (DEMOCRACY) سے نکلا ہے۔ جو دو اجزاء سے ترکیب پذیر ہے ایک جز کے معانی جمہور کے ہیں اور دوسرے جز کے معانی حکومت اور قانون کے۔ اس کے اصطلاحی معانی کا اطلاق ایسے اسلوب حکومت پر ہوتا ہے۔ جس میں عوام اور جمہور کی بڑی سے بڑی تعداد شریک ہو۔" (۱)

جمہوریت کی دو بڑی بڑی اقسام ہیں۔ یعنی بلاواسطہ جمہوریت (DIRECT DEMOCRACY) اور بالواسطہ جمہوریت (INDIRECT DEMOCRACY)۔ اول الذکر میں قوم کی مرضی کا اظہار براہ راست افراد کی رائے سے ہوتا ہے۔ ارباب جمہوریت کا کہنا ہے کہ جمہوریت کی یہ اولیٰ قسم قدیم یونان کی شہری مملکتوں میں موجود تھی۔ آج کل صرف سوئزرلینڈ کے چند شہروں میں اس کے آثار قدیمہ ملتے ہیں۔ اس نظام حکومت میں قوم کے تمام افراد ایک جگہ جمع ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ریاست کا رقبہ بہت محدود ہو اور عوام کا سیاسی اور اخلاقی پایہ بہت بلند ہو۔ راقم الحروف کی رائے میں اس طرز کی حکومت صرف اسلام کے ابتدائی دور رسالت میں رائج تھی۔ جب انسانیت اپنی معراج کو پہنچ رہی تھی۔ غزوات اور معاہدات کے ضمن میں صحابہ کرامؓ سے حضور اکرمؐ کی مشاورت غالباً اسی ذیل میں آتی ہے۔ البتہ موخرالذکر بالواسطہ جمہوریت ہی وہ جدید مغربی جمہوریت ہے جو صدیوں سے اہل علم اور اہل سیاست کے زیر

بحث چلی آرہی ہے اور غالباً اسی کثرت خیال آرائی کی وجہ سے جمہوریت کے مفہوم میں قدرے ابہام پیدا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بجا فرماتے ہیں۔

" جمہوریت بھی ان مبہم تصورات کی طرح ہے جن کے کوئی معانی متعین نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں ہر قوم یا جمہوریت کی خواہاں ہے اور اس کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ یا اس بات کی مدعی ہے کہ صحیح جمہوریت صرف ہمارے پاس ہے۔ اس کے علاوہ اور اقسام کی جمہوریت کے دعوے سب بے بنیاد اور محض ابلہ فریبی ہے۔ " (۲)

یہی وجہ ہے کہ آج یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ جمہوریت کی اصل تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد ۵۱۰ ق م میں روسیوں نے ڈالی تھی۔ (۳) جبکہ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ صدقہ جاریہ عظیم برطانیہ کا ہے۔ (۴)۔ ڈاکٹر خلیفہ جمہوریت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" جمہوریت وہ نظام ہے جس میں اقتدار اعلیٰ نہ سلاطین کو حاصل ہے اور نہ امرا کے طبقے کو۔ حکومت کی باگ دوڑ نہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں ہو اور نہ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے ہاتھ میں۔ مجلس آئین ساز میں جو نمائندے ہوں وہ آزادی سے عوام کے منتخب کردہ اہل الرائے ہوں " (۵)۔

قومی انگریزی اردو لغت میں جمہوریت کی تعریف ان الفاظ میں لکھی ہے۔

" وہ طرز حکومت جس میں اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں اور جس کا استعمال وہ خود یا ان کے منتخب نمائندے کرتے ہیں، وہ ملک جس میں ایسی حکومت قائم ہو، محدود معنوں میں ایسی ریاست جس میں اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہو اور وہی براہ راست اس کا استعمال کرتے ہوں نہ کہ منتخب نمائندوں کے ذریعے، معاشرے کی وہ کیفیت جس کی خصوصیت حقوق ومراعات کی برائے نام مساوات ہو، سیاسی یا سماجی مساوات، جمہوری روح، کسی برادری کے عام لوگ بمقابلہ صاحب حیثیت لوگوں کے، عام لوگ اپنی سیاسی قوت کے لحاظ سے " (۶)

مولانا شبلی نعمانی ایک شخصی اور جمہوری حکومت میں خط امتیاز کھینچتے ہیں۔

" جمہوری اور شخصی حکومت میں جو چیز سب سے بڑھ کر مابہ الامتیاز ہے وہ عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے۔ یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا زیادہ حق حاصل ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا " (۷)۔

غالباً یہی وہ بات ہے جس کو ابراہام لنکن نے اپنی مشہور زمانہ تعریف جمہوریت میں کہی ہے۔
" عوام کی حکومت ، عوام کیلئے اور عوام کے ذریعے "۔ ڈاکٹر ابوالفتح محمد صغیر الدین زیر بحث جمہوریت کے خدوخال بیان کرتے ہیں۔
" اس کے ظاہری خدوخال یہ ہیں کہ ایک پارلیمنٹ تشکیل دی جاتی ہے جو انتخابات کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ اس میں تمام بالغ حضرات و خواتین کی رائے شامل ہوتی ہے۔ اس کے ارکان امیدوار بن کر رائے دہندگان کے سامنے آتے ہیں اور جس نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے ہوں وہ کامیاب قرار پاکر پارلیمنٹ کا رکن (ممبر) منتخب ہوجاتا ہے۔ یہ پارلیمنٹ ایک خود مختار ادارہ ہے جس میں قانون سازی کثرت رائے سے ہوتی ہے۔ اور اس میں کثرت رائے کے مطابق عمل کرنے پر سربراہ مملکت مجبور ہے۔ اور سربراہ کی سربراہی بھی ارکان پارلیمنٹ کی اکثریت کی رہین منت ہوتی ہے۔ یہ سربراہ اپنی صوابدید سے کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ ضرورت ہو نہ ہو ممبران سے مشورہ لینا ضروری ہوتا ہے۔" (۹)

پاکستان میں مغربی جمہوریت کا تجربہ

اگر ہم اپنے کمزور سیاسی اعصاب سے مغربی جمہوریت کی وزنی اور پھٹی پرانی قبا کو تھوڑی دیر کے لئے اتاریں ، اپنے حواس درست کریں اور حقیقت کی دنیا میں سانس لینا سیکھیں اور جمہوریت کے محولہ بالا مفاہیم کو عملی شکل میں بشمول پاکستان دنیا بھر میں تلاش کریں تو ابراہام لنکن کی آخری امید (۱۰) اور جیفرسن (۱۱) کی انسانوں کی رائے کی احترام کرنے والی جمہوریت دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ (۱۲). پاکستان میں جمہوریت کی کامیابی تو بہت بعد کی بات ہے۔ کیا یورپ اور امریکہ وغیرہ ان کی جمہوریت کامیاب ہے یا کم ازکم کسی ایک ملک میں بھی مغرب کی پروردہ جمہوریت اپنے تمام تر لوازمات کے ہمراہ پائی بھی جاتی ہے؟ امریکہ جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور وہاں صدارتی نظام نافذ ہے۔ امریکی انتظامیہ کا حاکم اعلیٰ صدر ہے۔ اس فرد واحد کو بے شمار اور وسیع انتظامی اختیارات حاصل ہیں۔ اختیارات کے اعتبار سے اسے دنیا کا سب سے بڑا بااختیار حاکم کہاجاتا ہے۔ وہ کانگرس کے سامنے اپنی پالیسی کے لئے ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہے۔ عام حالات میں وہ کسی بھی مسودہ قانون کو مسترد کرسکتا ہے۔ (۱۳). ان اختیارات کا حامل انسان ڈکٹیٹر نہیں تو اور کیا ہے؟ اسے تو بجا طور پر عالمی ڈکٹیٹر کہا جاسکتا ہے۔ اب جبکہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت ناکام دکھائی دیتی ہے ، صدارتی نظام ہی خلافت راشدہ کے قریب ترین دکھائی دیتا

ہے۔ یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ خود امریکہ میں پارلیمانی طرز کا نظام حکومت کیوں نہیں ؟ اس کا جواب ایک امریکی دانشور ول ڈیورانٹ کی زبانی سنیئے۔

" ــــ ہم اتنے اصرار سے اپنے اعداء کو جمہوریت اختیار کرنے کی شہ دے رہے تھے ؟ نطشے اس رجحان کا ذکر کرتا ہے۔ " جو ہمسایہ حکومت کی جمہوریت کی پشت پناہی کرتا ہے کیونکہ یہ طرز حکومت قوم کو ناتواں بنادیتی ہے اور اس سے جنگ کرنے کی اہلیت چھین لیتا ہے "۔ غالباً چونکہ جمہوریت نااہل، بداخلاق، کندذہن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت دے دیتی ہے، اسی لیے اطالیہ، ہسپانیہ، یونان، روس، پولینڈ اور پرتگال میں جمہوریت آمریت میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اور شاید فرانس میں بھی یہی حالات پیدا ہوجائیں۔ ہماری حالت دیکھئے، سیاسی اصلاح کی تحریکیں شکست کھا گئی ہیں اور جہاں کہیں انہیں فتح ہوئی ہے وہ اس طرح کہ اصلاح، حکمران اقلیت کے ایما کے عین مطابق تھی۔ اوسط ذہن کامیاب ہوچکا ہے۔ ہر جگہ ذہانت جمہوریت سے پناہ مانگ رہی ہے۔ احمق لوگ انسانیت کے گھوڑے پر سواری کررہے ہیں "۔ (۱۴)۔ اس اقتباس میں دو چیزیں لائق توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ امریکہ اپنے دشمنوں کو جمہوریت پر مجبور کرتا ہے اور دوسری یہ کہ اس سے اس کا مقصد ان قوموں کو ناتواں اور کمزور بنانا ہے اس کا یہ تجربہ عربوں پر کامیاب رہا ہے۔ وہ اسلام دشمن اسرائیل کو جنگ اور طاقت کا راستہ دکھاتا ہے، جبکہ عربوں کو مذاکرات، معاہدات، احتجاجات کی سیاست سکھاتا ہے۔ یہی وہ جمہوریت ہے جس طرف جناب ول ڈیورانٹ نے بڑی صاف گوئی سے اشارہ کیا ہے۔ ذرا غور فرمائیں کیا یہ مہذب جمہوری قومیں دوسروں کی آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری کررہی ہیں ؟ کیا امریکہ اور اس کے اتحادی دنیا کی سیاسیات میں دخل در معقولات کے مرتکب نہیں ہورہے۔ امریکیوں اور یہودیوں کی چیرہ دستیوں سے پورا عالم اسلام بلبلا رہا ہے یہ ظلم جسے سیاسی ظلم کہنا زیادہ مناسب ہوگا ان ملکوں کے عوام کرتے ہیں یا حکمران ؟ امریکہ وہ مہیب ہاتھی ہے جو کھانے اور دکھانے کے الگ الگ دانت رکھتا ہے۔ عوام امریکی صدر اور کانگرس کو بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔ " جو چاہا سو آپ کیا، ہم کو عبث بدنام کیا "۔ یہ جمہوریت صرف الفاظ، افکار اور تکرار میں ملتی ہے۔ افراد، اقوام اور ملکوں میں اس کے وجود اور روح کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ نے کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔

" ــــ یورپ اور دیگر ممالک میں جو پارلیمانی حکومتیں قائم ہوئیں ان کا بھی یہی حال تھا کہ زیادہ تر ان میں سرمایہ داروں کی جنگ زرگری ہوتی تھی۔ مغربی جمہوریتوں کا عام طور پر یہی

اندازہ ہے ۔ محض علمی استعداد یا اخلاقی بلندی اور حق گوئی کی بناپر کسی شخص کا پارلیمنٹ میں گھسنا ایک ناممکن سی بات ہے ۔ (۱۵) ۔ علامہ اقبال نے یہی بات اپنے مخصوص شعری انداز میں کہی ہے

گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں

یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری (۱۶)

اس ربط میں مولانا سید ابوالاعلی مودودی کا تبصرہ بھی قابل ذکر ہے ۔

" جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے ، عمل کی سرحدمیں آکر وہ رخصت ہوجاتے ہیں ، اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کرکے ان پر اپنی خواہشات مسلط کردے " (۱۷) ۔

(۱۸) . کارلائل کا قول ہے " کہ جمہوریت اپنی نوعیت ہی میں متناقص بالذات ہے ۔ اس کا نتیجہ صفر ہے " (۱۹) . جو شیلیے جمہوریت پسند روسو نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ " صحیح جمہوریت نہ کبھی وجود میں آئی ہے نہ آئے گی " (۲۰) ۔ افسوس فرانس کے مشہور فلسفی ، شاعر ، انشاپرداز اور بانی تحریک رومانیت نے اسلام کا نظام حکومت اور خلفائے راشدین کی تاریخ نہ پڑھی ورنہ وہ یہ بات کبھی نہ کہتا ۔ دنیا میں اب مغربی جمہوریت ہے نہ حقیقی اسلامی جمہوریت ، روح جمہوریت عرصہ ہوا پرواز کرچکی ہے ۔ اقبال نے اسی روحانی زوال کے پس منظر میں جواب شکوہ میں فرمایا تھا ۔

رہ گئی رسم اذاں ، روح بلالی نہ رہی

فلسفہ رہ گیا ، تلقین غزالی نہ رہی (۲۱)

تاہم آپ اگر اسی پر مصر ہیں اور اس لنگوٹی ہی کو جمہوریت کہتے ہیں تو تھوڑی دیر کیلئے آپ ہی کی بات مان لیتے ہیں لیکن پھر آپ اعتراض نہ کیجئے گا کہ صاحب . جمہوریت تو آئی ہی نہیں تو ناکامی کیسی کیونکہ جب اس حوالے سے بات چلتی ہے تو ہرتان اس فکر پر ٹوٹتی ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں صحیح جمہوریت نافذ ہی نہیں ہوسکی ۔ مولانا مودودی کا قول اوپر نقل ہوچکا ہے اب ایک اور فرمان ملاحظہ فرمائیں ۔ " یہاں جو چیز ناکام ہوئی وہ جمہوریت تھی ہی نہیں " (۲۲) ۔ چند لائنوں کے بعد بات کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں ۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے ؟ یہاں تو جو چیز قائم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمریت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہورہا تھا ۔ اب اگر اس کے برے نتائج سامنے آگئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے " (۲۳) ۔

ڈاکٹر صفدر محمود کا بھی یہی خیال ہے۔

" یہ مفروضہ کے جمہوریت پاکستان ناکام ہوچکی ہے، ہر اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں جمہوریت کو حقیقی معنوں میں کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا " (۲۴) بعدازاں ڈاکٹر صاحب نے اس بیان کے حق میں بڑے جاندار دلائل دیئے ہیں جن سے کسی حد تک انکار ممکن نہیں ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہاں 50 سال گزرنے کے باوجود جمہوریت نافذ کیوں نہیں کی جاسکی ؟ جبکہ ہندوستان میں یہی نظام نسبتاً کامیابی سے چل رہا ہے اس کے باوجود کہ بھارت دنیا کا طویل ترین آئین رکھنے والی جمہوریہ ہے ، اور کیا یہ ممکن ہے کہ وطن عزیز میں مغربی جمہوریت برگ وبار لائے گی ؟ اس کا صاف صاف جواب یہی ہے کہ پہلے تو پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس کا کامیاب ہونا ناممکن ہے ، اور اگر یہ امر محال واقع ہو بھی جائے تو اس سے ہمارے وہ مسائل حل نہیں ہوں گے جن کے پیش نظر ہم نے جمہوریت اپنے اوپر زبردستی مسلط کر رکھی ہے ، نہ جانے ہم ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ باہر سے آنے والی ہر چیز ہمارے لیے مفید ثابت ہوگی۔ ہر قوم اور ملک کی اپنی تاریخ ، ثقافت اور ملی و مذہبی روایات ہوتی ہیں۔ کوئی ایسا نظام جو قوموں کے سرمایہ حیات سے متصادم ہو وہاں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اور پھر جس نظام میں خامیوں کی بھرمار بھی ہو۔ کسی بھی نظام کی کامیابی کیلئے دو چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں ان کے بغیر کبھی بھی کوئی نظام کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ پہلی بات جو بنیادی ہے وہ یہ کہ وہ نظام اپنی مبادیات اور تشریحات میں کامل اور اکمل ہو جیسا کہ دین اسلام ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام۔ (۲۵) الیوم اکملت لکم دینکم۔ (۲۶)

اللہ کے نزدیک مکمل اور پسندیدہ دین اسلام ہے ، اور اس کی تشریحات کے عملی نمونہ کے بارے میں فرمایا " لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ " (۲۷)۔

دوسری اہم شرط یہ ہے کہ اس نظام کو نافذ کرنے والی ایجنسیاں اس نظام سے پوری طرح مخلص ہوں ، جیسا کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ۔ قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز یہی دو چیزیں تھیں۔ ہم نے پاکستان کی فلاح وبہبود کیلئے جو نظام منتخب کیا ہے وہ (مغربی جمہوریت) نہ تو اپنی تمام جہات میں اکمل ہے اور نہ اس کو نافذ کرنے والے ہی اس سے مخلص ہیں۔ پھر بھلا اس کی ناکامی کا کیا رونا ، خاص طور پر اس وقت جب اس کے بانی اور متولی ہی اس کی اصل کے ناقص ہونے کی گواہی دیں۔ آئیے ہم ان ہی دو شرطوں کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان میں مغربی

جمہوریت کی ناکامی کا جائزہ لیں ۔ یہ طرز حکومت اسلام کے سیاسی نظام سے مطابقت نہیں رکھتا مناسب ہوگا کہ یہاں اختصار کے ساتھ مغربی جمہوریت کے ان عناصر کو بیان کردیا جائے جن کی وجہ سے یہ پاکستانی عوام کیلئے ناقابل عمل اور ناقابل قبول ہے ۔

1. (ووٹرز) رائے دہندگان اور امیدواران کی اہلیت کا معیار :۔

مغربی جمہوریت میں سربراہ کا تقرر یا نمائندہ کے انتخاب کیلئے بالغ رائے دہی کا اصول کار فرماہوتا ہے ۔ رائے دہندگان کیلئے کوئی اہلیت نہیں بجزاس کے کہ جو شخص 18 یا 21 کا ہوجائے وہ اپنا حق رائے دہی کسی بھی نمائندہ کے حق میں استعمال کرسکتا ہے ۔ اس ضمن میں عالم و جاہل ، نیک و بد ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں ۔ دونوں کے ووٹ کی حیثیت یکساں ہے ۔ یہ بات نہ صرف تعلیم اسلام اور قرآن کے خلاف ہے بلکہ عام دنیاوی دستور کے بھی موافق نہیں ہے ۔ آپ فرمائیے اپنی امانتیں ایسے لوگوں کو سونپتے ہیں جن پر آپ کو اعتماد نہیں ہوتا ۔ ووٹ بھی ایک قومی امانت ہے ۔ اللہ اسے ایماندار اور اہل لوگوں کے حوالے کرنے کی ہدایت کرتا ہے ۔

(ان اللہ یامرکم ان تودوٴالامانات الیٰ اھلھا) (۲۸) اسی طرح نیک و بد کی رائے برابر نہیں ہوسکتی ۔ افمن کان مومناً کمن کان فاسقاً لایستوون " (۲۹) ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا !

" ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون " (۳۰) ۔ قرآن حکیم نے ایک دوسرے مقام پر عقل مند اور بے وقوف کا موازنہ ان الفاظ میں کیا ہے ۔ " قل لا یستوی الخبیث والطیب " (۳۲)

یہ بات کوئی محتاج بیان نہیں ہے کہ پاکستان کی حکومت اور عوام اپنے اپنے معاشی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں ۔ عوام صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے نمائندے ایسے لوگ ہوں جو ہمیں بھوکا نہ مرنے دیں ، ایک عام آدمی کو تو یہ سہولت بھی میسّر نہیں کہ وہ انتخاب لڑنے والی پارٹیوں کے منشور ہی پڑھ سکے ۔ ان حالات میں وہ ملک وقوم کو درپیش مسائل میں کیا رائے دے سکتا ہے ۔ امریکی فلسفی ول کاڈیورانٹ کا یہ قول ہمارے حال پہ کس قدر صادق آتا ہے ۔

" رائے دہندگان فون ، تیل ، لکڑی کے معاملات میں الجھا ہوا ہے وہ اپنے آپ کو ان ہزاروں مسائل سے کیونکر باخبر رکھ سکتا ہے جو اس کی جماعت ، انجمن یا ادارے کو درپیش ہیں ۔ وہ اپنی جماعت کے بارے میں سوالات کا صحیح جوابات نہیں دے سکتا ۔ کیونکہ وہ تو بے خبر ہے ۔ جمہوریت بے خبر لوگوں کی حکومت کا نام ہے " ۔ (۳۳) اس کے ساتھ ساتھ اس نظام میں ممبران

پارلیمنٹ کیلئے بھی کوئی شرط عائد نہیں کی۔ ہر بلغ شہری جو ووٹ دے سکتا ہے ملک کا انتخاب بھی کرسکتا ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری اسمبلیوں میں اکثریت ناخواندہ، جاگیرداروں، زمینداروں، سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی ہوتی ہے۔ اور ان کی بے دینی اس پر مستزاد ہوتی ہے۔ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ہم ان ارباب حل وعقد کے سیاسی واخلاقی معیار سے واقف بھی ہوتے ہیں۔ لیکن نظام سیاست اور اپنے مخصوص مسائل کے زیر اثر ہم ان میں سے کسی کو اپنی تقدیر کا مالک بنانے پر مجبور ہوتے ہیں، جبکہ قرآن نے ایماندار اور صلح لوگوں کا حاکم بنانے کا اعلان کیا ہے۔

" وعداللہ الذین امنوامنکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم (۳۴) –

لیکن سیاسی جماعتوں کی موجودگی میں امیدواران کو کون دیکھے گا۔ یہاں فرد کے جماعت کو ووٹ ملتا ہے البتہ فرد کو ٹکٹ ملتا ہے۔ ان حالات میں نیک اور ایماندار لوگ اسمبلیوں تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں؟، اور اگر دوچار ہوں بھی تو وہ مغلوب حیثیت میں اکثریت کے ہاتھوں غیر موثر ہوجاتے ہیں، پھر منتخب نمائندہ بھی وہی کرے گا جو پارٹی کا سربراہ کہے گا۔ فلور کراسنگ کے متعلق جو حال ہی قانون سازی ہوئی ہے اس نے پارٹی سربراہ کو فیصلہ کن قوت کا مالک بنا دیا ہے۔

2۔ اقتدار اعلیٰ کا تصور یا شرکت اقتدار کا فریب :-

مغربی جمہوریت کی تعریف کی رو سے شرکت اقتدار کیا ہے۔ " سارے کا سارا اقتدار ہی عوام کا ہوتا ہے "۔ لیکن اس قول کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ ووٹ کی پرچی ڈالنے کے بعد آپ اپنے کام سے فارغ ہوجاتے ہیں۔ بس آپ ملک وقوم کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرچکے۔ اب آپ بے بس ہیں اور اپنے جائز وناجائز کام کے لئے آپ اپنے نمائندے کے دست نگر اور مرھون منت ہوتے ہیں۔ حاکم وہ ہے یا آپ ؟ اسلام میں شرکت اقتدار کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں حکم اللہ ہی کا چلتا ہے۔ " ان الحکم الا للہ " (۳۵) دوسری جگہ یہی بات کس قدر بہ صراحت بیان کی ہے۔

" یقولون ھل لنا من الامر من شئی ط قل ان الامر کلہ للہ " (۳۶)

قرآن پاک کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ اگر آسمان اور زمین میں چند معبود ہوتے تو زمین اور آسمان میں فساد پیدا ہوجاتا۔ اگر اسلام میں شرکت اقتدار کی گنجائش ہوتی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بڑھ کر کوئی اسلامی احکام پر عمل کرنے والا نہیں۔ وہ سقیفہ بنی ساعدہ میں بعض صحابہ کرامؓ کی اس تجویز کو مان لیتے کہ ایک مہاجرین میں سے ہو اور ایک انصار میں سے ہو۔ دراصل کاروبار حکومت میں شرکت اقتدار سے زیادہ مشاورت، مداخلت اور تقسیم کار کے اصول زیادہ اہم ہیں۔

اسلام میں امیرالمومنین حکمران نہیں بلکہ عوام کا محافظ اور خادم ہوتا ہے۔ اور عوام کو حکومتی امور میں پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ غالباً یہی حقیقی جمہوریت کی روح ہے۔ ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے اولین خطبہ میں فرمایا!

" آگاہ رہو کہ میں تو صرف ایک بشر ہوں اور تم میں سے کسی ایک سے بھی بہتر نہیں۔ لہذا میری رعایت کرو، جب مجھے دیکھو کہ راہ راست پر ہوں تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ میں کج ہو گا تو سیدھا کر دو " (۳۷)۔

حضرت عمر فاروقؓ سے مضبوط حکمران اسلام میں کوئی نہیں گزرا۔ امور سلطنت سے لیکر اپنی ذات تک امور میں عوام کی مداخلت کو ان کا آئینی اور سیاسی حق خیال کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ احتساب کی بیسیوں مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک واقعہ بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دفعہ یمنی چادریں آئیں۔ آپؓ نے سب کو ایک ایک چادر عنایت کی اور خود بھی ایک ہی چادر رکھی۔ وہ چادر آپ کے لئے نا کافی تھی، چنانچہ آپ کے بیٹے عبداللہ نے اپنی چادر بھی باپ کو دے دی۔ جب حضرت عمرؓ ان چادروں کا کرتا پہن کر منبر پر آئے تو حسب معمول کہا " اسمعوا واطیعوا" تو مجمع سے آواز آئی ہم نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے۔ آپؓ منبر سے نیچے اتر آئے اور کہا ابوعبداللہ (سلمان فارسی) کیا بات ہے ؟ کہا عمرؓ تم نے دنیاداری برتی ہے۔ تم نے ایک ایک چادر تقسیم کی تھی اور خود دو چادریں پہن کر آئے ہو اس پر آپؓ کے بیٹے عبداللہ نے وضاحت کی (۳۸)

مولانا شبلی نعمانی نے کسی جمہوری سلطنت کی اخیرحد یہ بیان کی ہے کہ مسند نشین حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائیں اور وہ جماعت کا صرف ایک ممبر بن کر رہ جائے (۳۹)۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ حد عبور کرلی تھی اور اسلامی جمہوریت کی روح کو کمال تک پہنچادیا تھا۔ بیت المال پر آپؓ کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کہ ایک عام آدمی کا ہوسکتا ہے۔ اس لیے جب اپنے علاج کی غرض سے شہد کی ضرورت پڑی تو ایک کپا شہد کے لیے شوریٰ کا اجلاس طلب کیا۔ (۴۰)۔

ایک دفعہ مال غنیمت آیا تو صاحب زادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا " جان پدر تراحق میرے ذاتی مال میں ہے۔ یہ تو مال غنیمت ہے تو نے اپنے باپ کو دھوکہ دینا چاہا " (۴۱)۔ اپنے بیٹے عبدالرحمن کو نبیذ پینے کے جرم میں حاکم مصر سے سزا دلوائی، ننگے پالان پر سوار مدینہ بلوایا، قید کردیا جہاں وہ وفات ہوگئے " (۴۲) زہدوفقر کی زندگی گزاری لیکن رعایا پروری میں کوئی آپ کا ثانی نہ ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ عمرؓ نے اپنے جانشینوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اپنے گورنروں کا احتساب بڑی سختی سے کرتے تھے۔ ان

کے مکانات، اثاثہ جات، اراضیات لے کر ملبوسات تک کی خبر رکھتے تھے۔ (۴۳) ہر سال حج کے موقع پر کھلی کچہری لگتی اور تمام عاملوں کو عوام کے سامنے عدالت میں پیش کیاب جاتا (۴۴)۔

آپ خود فرمائیے جس قوم کا جمہوری مزاج، شرکت اقتدار، مداخلت کارحکومت اور احتساب کا یہ عالم ہو وہ بھلا ایسی جمہوریت کو کیونکر منہ لگائے گی جس کے زیر اہتمام جمہوری حکمرانوں سے کسی عام آدمی کا ملنا بھی امرمحال ہو۔ جہاں انصاف نام کی کوئی چیز نہ ملتی ہو، جہاں روزانہ سینکڑوں عصمتیں پامال ہوتی ہوں، جہاں قتل وغارت روزانہ کا معمول بن جائے، انصاف کیجئیے کہ عوام کو جان، مال اور آبرو کا تحفظ چاہیے یا خالی بے ثمر جمہوریت؟ ایسا لگتا ہے کہ عوام نے سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ ان پر کون حکومت کرتا ہے، وہ تو صرف اخلاقی وسیاسی امن چاہتے ہیں، معاشی آسودگی چاہتے ہیں، یہ عوام کی دکھتی رگیں ہیں جن سے جمہوری سیاست دان خوب واقف ہیں۔ ایک وہ اسلامی جمہوریت تھی جس میں فرات کے کنارے کتا بھی پیاسا نہیں مرتا تھا۔ ایک یہ جمہوریت ہے جہاں فرات میں بے گوروکفن لاشیں اس کا منہ چڑاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سوچئے یہ مقام عبرت نہیں تو کیا ہے؟

3. جمہوریت کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں ہر شخص آزاد اور مساوی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا بھی ہے تو ہر شخص کو آزادی ہونا چاہیے کہ وہ جو چاہے رائے دے اور پھر ہر شخص کی رائے پر عمل کیا جائے۔ حالانکہ جمہوری حکومت میں جب کثرت رائے سے جب فیصلہ ہوجاتا ہے تو اس کے مطابق قانون بن جاتا ہے، ارر اس پر عمل ان لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے جو تعداد میں وقلیل ہوتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں تو یہ کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیسی آزادی ہے کہ لاکھوں، کو پارلیمنٹ کا پابند بنادیا جاتا ہے۔ اس لیے آزادی کا بعینہ فائدہ جمہوریت سے حاصل نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اس تصور آزادی سے ناجائز فائدہ ضرور اٹھاتے ہیں اور اس کا تعلق سیاسی شعور اور آگہی سے جاجوڑتے ہیں۔ آجکل جرائم کی بھرمار اسی مادر پدر آزادی کا نتیجہ ہے۔ اسلام میں آزادی کا تصور بالکل مختلف ہے۔ اس میں آزادی حضور ؐ کی سچی غلامی کا نام ہے۔ جمہوریت جس چیز کو آزادی کہتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں غلامی ہے وہ اپنے نفس کی غلامی کے علاوہ سینکڑوں، ھزاروں کی غلامی بھی ہے۔ اقبال نے اس آزادی کو ایک دھوکہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیراز نوائے قیصری
دیو استبداد، جمہوری قبا میں پائے کو　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (۴۵)

4۔ اسلام کو جمہوریت کے اس بنیادی اصول سے بھی اختلاف ہے کہ یہ اکثریت کی رائے کو واجب التسلیم قرار دیتی ہے۔ جس کے بیلٹ بکس (BALLET BOX) سے زیادہ ووٹ برآمد ہوئے وہی ملک کے قانون ساز اداروں کا ممبر منتخب ہوگیا، اور جس کے حق میں زیادہ ہاتھ اٹھ جائیں یعنی جسے ایوان کا اعتماد حاصل ہو وہ وزیراعلیٰ یا وزیراعظم منتخب ہوجاتا ہے۔ یہی وہ صورتحال ہے جس پر اقبال نے تنقید کی ہے۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا جاتا ہے، تولا نہیں کرتے (۴۶)

یہ شعر ضرب کلیم کا ہے جو علامہ نے ۱۹۳۶ء میں مکمل کی۔ گویا یہ پختہ عمر کا کلام ہے جسے آپ نے دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی مفہوم کا ایک شعر پیام مشرق میں بھی ہے۔ یہ کتاب علامہ نے ۱۹۲۳ء میں گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی۔ (۴۷) شعر ملاحظہ فرمائیں

گریز از طرز جمہوری، غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید (۴۸)

اعداد و شمار کی اس تسلسل میں قرآن حکیم کی یہ آیات ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں۔

فمن ثقلت موازینہ فاؤلیک هم المفلحون (۴۹) ومن خفت موازینہ فاؤلیک الذین خسروا (۵۰)

سورۃ القارعہ میں بھی یہی مضمون انہی الفاظ میں قلمبند کیا گیا ہے۔ غالباً جمہوریت پر یہ اعتراض قدیم ترین تصور کیا جاتا ہے۔ یونانی مصلح سقراط (369 - 399) کا اعتراض اب تک جمہوریت مخالفین کی خدمت کررہا ہے۔ سقراط نے کہا تھا۔ "اس جمہوریت سے زیادہ مضحکہ خیز اور کیا چیز ہوسکتی ہے جس کی ناک میں ہجوم نے نکیل ڈال رکھی تھی۔ جہاں جذبات کا دور دورہ تھا، جہاں حکومت ایک مجلس مباحثہ تھی، جہاں فوج کے سپہ سالار بن سوچے سمجھے انتخاب، برخاست اور ہلاک کئے جاتے تھے، جہاں حروف تہجی کے اعتبار سے موٹی عقل رکھنے والے کسانوں اور تاجروں کو منتخب کرلیا جاتا تھا کہ سلطنت کی عدالت عالیہ کے ارکان کی حیثیت سے کام کریں"۔ (۵۱)

ول ڈیورانٹ نے بھی اپنی کتاب نشاط فلسفہ میں اسی اعتراض کو نقل کیا ہے۔

"جمہوریت جس نے انسان کو آزاد کرنے کی ٹھانی تھی، خود ایک کل بن گئی ہے۔ جس نے بے ذہن اجتماع کو رائے دہندگی کا حق عطا کیا۔ ان کلوں اور آلوں کے خلاف فرد کا احتجاج اس قدر بے سود تھا جتنا کہ مشرق میں اجتماع کی خلاف فرد کی آواز، حتیٰ کہ قائدین بھی کلوں کے

ہیں بے جان اور بے روح اجزا بن گئے ، جو اپنے فریب خوردہ پیروؤں کی طرح جنہیں انتخابات میں فقط گنا جاتا تھا ، بے حس ہوکر رہ گئے "۔ (۵۲)

اس طرز جمہوری کے مقابلہ میں اسلام کثرت وقلت کی بجائے صحت واصابت رائے کا اعتبار کرتا ہے اگر اکثریت کی رائے کے واجب التسلیم ہونے کی کوئی دینی اہمیت ہوتی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ لشکر اسامہؓ اور مانعین زکوٰۃ کے معاملات میں حضرات صحابہ کرامؓ کی بات مان لیتے ، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے وہ کیا جسے اسلام اور مسلمانوں کی عظمت ووقار کیلئے ضروری سمجھا ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امیر کے سامنے کسی بات کرنے ہی کی اجازت نہیں ہے اسلام میں مشاورت کی بڑی روشن تاریخ موجود ہے ۔ ارشاد ربانی ہے ۔ " وامرھم شوریٰ بینھم " (۵۳)

سورۃ آل عمران جنگ احد میں نازل ہوئی جس میں حضورؐ کو تاکید کی گئی کہ آپ اپنے کاموں میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کریں ۔ " وشاورھم فی الامر " (۵۴) ۔ لیکن سوال پھر وہی ہے کہ ان حالات میں مشیر کی اہلیت کیا ہونی چاہیئے ۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں بھی رہنمائی فرماتا ہے " فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون " (۵۵) ۔ بات پھر وہی ہے کہ نہ ہر شخص امین ہوسکتا ہے نہ اہل الذکر ۔ پس حکومتی امور میں ہر کس وناکس سے مشورہ نہیں کیا جاسکتا ۔ پارلیمانی جمہوریت میں سربراہ مملکت پارلیمنٹ سے مشورہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ یہ الگ بات ہے یہاں اتنا بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا ۔ مشورہ سے پہلے باہم مشورہ کی روایت چلی آرہی ہے ۔ اسلام میں یہ فرق ہے کہ امیر مشورہ تو کرے گا لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس پر عمل بھی کرے ۔ مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے کسی سے مشورہ نہیں کیا ۔ جنگ بدر میں قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا اور حضرت عمرؓ کی بجائے ابوبکرؓ کے مشورہ پر عمل کیا ۔ غزوہ احد اور غزوہ خندق کے مواقع پر بھی مشورے ہوئے ۔ اذان کی ترویج کے بارے میں مشورہ ہوا ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع قرآن کے بارے میں مشورہ کیا اور اکثریت کے خلاف کیا ۔ حضرت عمرؓ کا قول مشہور ہے کہ خلافت مشورہ کے بغیر نہیں چل سکتی ۔ آپ نے باقاعدہ ایک شوریٰ ترتیب دی ہے (۵۶) مختصر یہ کہ اسلام میں مشاورت بحث ومباحثہ کی ایک طویل تاریخ ہے ۔ لیکن فیصلے کثرت وقلت سے بے نیاز ہوکر اسلام ، مسلمان اور انسان کی فلاح میں ہوتے ہیں ، جبکہ پارلیمنٹ میں حکمران پارٹی اپنی مرضی کے بل لاتی ہے ۔ برائے نام بحث ہوتی ہے اور دونوں ایوانوں کی منظوری سے یہ بل قانون میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب ایوان میں زمینداروں اور جاگیرداروں کی اکثریت ہوتی ہے تو زرعی

ٹیکس کی مخالفت ہوتی ہے اور جب کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ برسراقتدار آتا ہے تو صنعت اور انڈسٹری کو مراعات سے نوازا جاتا ہے ۔ ان حالات میں جمہوریت پاکستان کے لوگوں کیلئے جن کی اکثریت غریب اور متوسط طبقات سے تعلق رکھتی ہے کوئی قابل فخر چیز نہیں رہ جاتی ، اور بار بار کے تجربات نے عوام کی تمام خوش فہمیاں ختم کردی ہیں ۔ یہ تھی جمہوریت کی مبادیات جن سے اسلام اتفاق نہیں کرتا اس نوع کے کچھ اور اختلافات مولانا حامدانصاری نے اپنی کتاب " اسلام کا نظام حکومت " (۵۷) میں بیان کیے ہیں ۔ مزید تفصیل کیلئے مولانا عبدالرحمن کیلانی کی " خلافت و جمہوریت " (۵۸) ملاحظہ فرمائیں ۔ مولانا مودودی کی " اسلامی ریاست " (۵۹) بھی اسی موضوع پر قابل ذکر کاوش ہے ۔

مغربی مبصرین کا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ مغربی جمہوریت کے ناکامی کے اسباب ہمارے ملک کے اساسی نظریئے یعنی اسلام میں دیکھے جاسکتے ہیں ۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنی کتاب " کیتھ لارڈ " کا بیان نقل کیا ہے ۔

" اسلام ضابطۂ اختلافات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور یہ کہ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک اچھی ریاست کا تصور ایک مضبوط لیڈر اور اس کی قیادت میں اپنے مقصد کی لگن سے سرشار اور متحد قوم سے عبادت ہے " (۶۰) ۔ کیتھ لارڈ کا یہ کہنا کہ اسلام حزب اختلاف کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا حقیقت پر مبنی نہیں ہے ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں نہ تو سیاسی پارٹیوں کا وہ رجحان ہے جو مغرب ومشرق میں جمہوریت کے زیر اثر پروان چڑھا اور نہ ہی حزب اختلاف کا معروف سیاسی واصطلاحی تصور ۔ رہی بات حکومت پر تنقید اور مداخلت کی تو یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اسلامی حکمران کی حیثیت بھی ملک کے کسی ایک فرد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی ۔ تبصرہ کا دوسرا حصہ بالکل درست ہے کہ مسلمان اپنے مرکز اور جماعت سے نہیں ٹوٹتے ، اختلاف ہوسکتا ہے لیکن یہ امیر کی اطاعت کو منقطع کرنے والا نہیں ہوتا ۔ حضرت عمرفاروقؓ اور خالد بن ولیدؓ کے اختلاف سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے ۔ بحث کے اس حصہ کے آخر میں کم ازکم اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ جمہوریت ہمارے مزاج کے خلاف نہ سہی ، اسلامی مزاج کے خلاف تو ہے نا اور ابھی ہمارا عمومی مزاج اسلامی ہی ہے ، اور اپنے اس خیال کی تائید میں تاریخ پاکستان سے دو مثالیں دے کر آگے بڑھتا ہوں ۔ ڈاکٹر صفدر اپنے اس بیان کے تحفظ میں کہ جمہوریت پاکستانی عوام کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے ، تحریک قومی اتحاد ۱۹۷۷ء کے حوالے سے رقمطراز ہے ۔

" تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں کسی ایسے ملک کی مثال نہیں ملتی جس کے عوام نے اپنے ووٹ کے تقدس کے تحفظ کی خاطر اتنی قیمتی جانوں اور املاک کا نذرانہ پیش کیا ہو جتنا پاکستان کے عوام نے ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد کی تحریک کے دوران پیش کیا۔ حقیقت میں یہ پاکستان کے اس عام شہری کی فتح تھی جو ہر قیمت پر جمہوریت کی بالادستی کا خواہاں ہے۔ کیا ایسی قوم کو جو اپنے ووٹ کے تقدس کا اس قدر شعور رکھتی ہے جمہوریت کے لیے نااہل قرار دینا ناانصافی ہے" (۴۱) اب یہ بات تو ہر خاص وعام کو معلوم ہے کہ ۱۹۷۷ء کی یہ تحریک نفاذ اسلام کی تحریک تھی اور مولانا مفتی محمود کی قیادت میں تمام مذہبی جماعتیں اس وقت کے جمہوری حکمرانوں کے خلاف صف آراء ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر موصوف جیسے نقاد کو اسلام کی خاطر دی گئی قربانیوں کو جمہوریت کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہئے تھا۔ دوسری مثال آج کی تاریخ سے ہے۔ موجودہ حکومت کو یہ مینڈیٹ بھی اسی جمہوریت پسند جماعت و حکومت کے خلاف نظام خلافت راشدہ کے وعدہ پر عنایت ہوا ہے۔ ارباب سیاست یہ جمہوری تماشا اسلام کے تبادلے میں کرتے ہیں۔ اس لیے عوام نے بار بار اسلام کی چاہت میں دھوکہ کھایا ہے نہ کہ جمہوریت کے عشق میں۔

سیاست دان اور حکمران:-

پاکستان میں دوسری بڑی وجہ جسے مغربی جمہوریت کی ناکامی میں بیان کیا جاتا ہے وہ یہاں کے سیاستدان اور حکمران ہیں، اور غالباً ملک میں واحد یہ شعبہ ہے جس میں استثناء کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی حکمران ایسا ہو کہ جس نے ملوکیت اور بادشاہت کے دعویٰ سے اقتدار کے مزے لوٹے ہوں۔ حتیٰ کہ مسولینی اور ہٹلر دونوں جمہوریت کے مدعی تھے۔ " کہ یہ بھی جمہوریت ہی ہے جو دوسری قسم کی جمہوریتوں پر فائق ہے" (۴۲)۔ چنانچہ کسقدر افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ جس نظام کی مہربانی سے مسند اقتدار تک پہنچے۔ اپنے فعل و عمل سے شعوری اور لاشعوری طور پر اسی نظام کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہیں۔ جس تالی میں کھایا اسی میں چھید کر دیا۔ قائد اعظم کو جمہوریت پر پختہ یقین تھا انہوں نے ۱۹۴۳ء میں فرمایا کہ جمہوریت ہمارے خون میں شامل ہے۔ یہ ہماری رگ رگ میں بسی ہوئی ہے لیکن یہ کونسی جمہوریت تھی۔ علامہ اقبال والی اسلامی روحانی جمہوریت ابراھام لنکن اور جیفرسن والی عوامی جمہوریت۔ اس کا جواب ہم قائد ہی کے الفاظ میں دیتے ہیں۔

" مسلمانوں کیلئے پروگرام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس تو تیرہ سو برس سے

ایک مکمل پروگرام موجود ہے اور وہ قرآن پاک ہے ۔ قرآن پاک ہی میں ہماری اقتصادی ، تمدنی ومعاشرتی اصلاح وترقی کے علاوہ سیاسی پروگرام بھی موجود ہے ۔ اور اسی قانون الٰہی پر ایمان ہے " (۳۶)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ قرآن کا سیاسی طریقہ کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی سلوک اور آئینی حقوق کا بہترین تصور موجود ہے ۔ (۴۴) بہرحال قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے اور آپ نے جمہوری اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا ۔ گویا آپ نے انتہائی خلوص سے ایک جمہوری روایت کی بنیاد رکھ دی ۔ لیکن بدقسمتی سے قائد کے سیاسی جانشین ان کی اعلیٰ جمہوری اقدار کو برقرار نہ رکھ سکے ۔ چنانچہ جناب لیاقت علی خان بیک وقت ملک کے وزیراعظم بھی تھے اور مسلم لیگ کے صدر بھی ۔ یاد کریں دور حاضر کی مسلم لیگ بھی اقتدار کی اسی مرکزیت پر دولخت ہوئی تھی ۔ ان صفحات میں پاکستان کی پچاس سالہ سیاسی تاریخ کا جائزہ تو نہیں لیا جاسکتا اور نہ ہی میرا مزاج ہے ، بہرحال چند باتوں کا اعادہ کرنا ضروری ہے تاکہ وطن عزیز میں جمہوریت کے ارتقاء پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑ سکے ۔ ان پچاس سالوں میں سے تقریباً ۲۵ سال تو فوجی حکمرانوں کی بھینٹ چڑھ گئے ، لیکن اس سے پہلے بے چاری جمہوریت کے ساتھ ایک زیادتی یہ ہوئی کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک عوام کو قومی انتخابات کا موقع نہیں دیا گیا ۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں بلوغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات منعقد ہوئے ، جس کے نتیجہ میں پاکستان پیپلز پارٹی برسراقتدار آئی ۔ پاکستان میں کوئی پی پی پی سے زیادہ جمہوریت پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی ۔ یہاں تک کہ اس جماعت کے موجودہ قائد کا دعویٰ ہے کہ جب وہ اقتدار میں ہوتی ہیں تو جمہوریت ہوتی ہے اور جب ایوان اقتدار سے باہر تو ہر طرف آمریت ہی آمریت ہوتی ہے ۔ قائد جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو مرحوم دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۳ اگست ۱۹۷۳ء تک ملک کے صدر رہے اور بعد ازاں ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء تک منتخب وزیراعظم کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے ۔ ۱۹۷۳ء کا آئین بھی اسی حکومت کا کارنامہ ہے ۔ آئین کی منظوری کے بعد یہ عام خیال تھا کہ اب جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں ۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا ۔

" سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر آئین کو پس پشت ڈال دیا گیا ۔ اور یوں آئین اس پارٹی کے ہاتھوں پامال ہو کر رہ گیا جو اس کی تشکیل پر نازاں تھی " (۴۵) گویا " اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے

چراغ سے"

"جمہوری عمل کے نتیجے میں برسراقتدار آنے والی جماعت نے جمہوری روایات اور سیاسی اداروں کو پنپنے کی اجازت نہ دی" (۶۶) پی پی پی کی جمہوری حکومت اپنے اقتدار کی بقاء کے لیے غیر جمہوری ہتھکنڈوں پر اتر آئی اور یوں ایک سیاسی ڈکٹیٹر شپ کی شکل اختیار کرگئی" (۶۷)۔

جناب عالی! ضیاء الحق تو ڈکٹیٹر تھا، آمر تھا، مطلق العنان بادشاہ تھا جو آپ کہیں وہ سب کچھ تھا، لیکن بھٹو تو جمہوریت پسند تھے، جمہوریت کے بانی تھے، جمہوری ملکوں کے تعلیم یافتہ تھے، جمہوری حکمرانوں کے تربیت یافتہ تھے اور ایک جمہوری عمل کی پیداوار تھے پھر انہوں نے جمہوری طرز عمل کیوں نہ اپنایا؟ آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو معروف دانشور ڈاکٹر صفدر محمود کی بات سنیے۔ "..... ان کے دور حکومت کا آغاز بہت سے توقعات اور آرزؤں کے ساتھ ہوا لیکن یہ بات بہت جلد واضح ہوگئی کہ ان کے قول وفعل میں بہت بڑا تضاد ہے۔ مغرب کی تعلیم کے باوجود وہ جاگیردارانہ جمہوریت پر عمل کرتے تھے۔" (۶۸) یہ شاید مغربی جمہوری تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ مرحوم نے اپنی ساری زندگی اپنی پارٹی کے انتخابات نہ ہونے دیئے اور نامزدگیوں کے ذریعے پارٹی چلاتے رہے (۶۹)۔ ۱۹۷۷ء میں روایتی زمینداروں، وڈیروں اور سجادہ نشینوں کو پارٹی ٹکٹ دیئے جس سے پارٹی کی جمہوری روح مرگئی ہے۔ (۷۰) لیکن پارٹی ابھی تک زندہ ہے اور کچھ دنوں پہلے برسراقتدار تھی۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی ہوئی جس کے نتیجے میں قومی اتحاد کی تحریک نے جنم لیا اور پھر ملک مارشل لاء کی گود میں جاگرا۔ صدر ضیاء الحق کی وفات کے بعد سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان نے صدر پاکستان کا عہدہ سنبھال لیا اور ضیاء الحق مرحوم کے اعلان کے مطابق نومبر ۱۹۸۸ء میں انتخابات ہوئے، جس کے نتیجہ میں ۲ دسمبر ۱۹۸۸ء کو بینظر بھٹو پہلی خاتون وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اب یکے بعد دیگرے پی پی پی اور مسلم لیگ اس ملک کی حکمران ہیں۔ دونوں پارٹیاں جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں، دونوں عوام کے بنیادی حقوق کی علمبردار ہیں۔ اب جبکہ مسلم لیگ ملک کی سیاہ وسفید کی مالک ہے اور مرکز کے علاوہ صوبوں میں بھی اس کی حکومت ہے تو گویا ملک میں پارلیمانی جمہوریت کی حکومت ہے۔ اب فیصلہ آپ کی صوابدید پر ہے کہ کیا حکومت امن وامان قائم کرنے میں قائم ہورہی ہے؟ کیا عوام میں غیر یقینی کی صورت حال بدستور موجود نہیں ہے؟ کیا ہر شخص کی جان ومال اور عزت محفوظ ہے؟ کیا انصاف جو کسی حکومت کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے عوام کو میسر ہے؟ ابھی حالیہ خوفناک جمہوری

مینڈیٹ کا آغاز ہے ابھی چار سال کا طویل عرصہ منتظر ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئیے ہوتا ہے کیا

زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حکومت کی کوشش ہے کہ ملک میں ہر قیمت پر امن قائم ہو، دوسری طرف جمہوریت کی آبیداری کیلئے کچھ اقدامات سامنے آئے ہیں جن سے جاگیردارانہ سیاست کو زد پہنچتی ہے، لیکن اندیشہ اقبال تو ابھی موجود ہے کہ یہ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی جنگ زرگری ہی ثابت نہ ہو۔ بیوروکریسی سرگرم عمل دکھائی دیتی ہے، پھر ہمارے یہاں ایک بہت بری روایت بھی ہے کہ حزب اختلاف قومی معاملات میں بھی حکومت کے ساتھ نہیں بیٹھتی جو بلاشبہ ایک غیر جمہوری رویہ ہے۔ اور اگر یہ رویہ بار بار سیاسی اور جمہوری پارٹیوں کی طرف سے موصول ہو تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وطن عزیز میں مغربی جمہوریت ناکام ہوچکی ہے۔ اب یا تو جمہوریت کو اس کی تمام تر خامیوں سے پاک کرکے اسے حلقہ بگوش اسلام کیا جائے جو بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے یا پھر اس ملک کو اس کے بوجھ سے آزاد کرکے خالص "خلافت راشدہ" کا نظام رائج کیا جائے۔ یوں بھی یہ وعدہ حکمران جماعت کے انتخابی منشور کا حصہ چلا آرہا ہے۔

حواشی و تعلیقات

(۱). محمد حنیف ندوی، مولانا، اساسیات اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1973، ص 205

(۲). خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، طبع ہفتم جولائی 1992، ص 215

(۳). اردو انسائیکوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، تیسرا ایڈیشن 1984، ص 503

(۴). محمد فاروق قریشی، پاکستان میں جمہوریت کا زوال، مکتبہ فکرو دانش، سن ندارد، ص 503

(۵). فکر اقبال، ص 215۔ (۶). جمیل جالبی، ڈاکٹر (___)، قومی انگریزی لغت، قومی زبان، اسلام آباد، طبع سوم 1996، ص 544۔ (۷). شبلی نعمانی، مولانا، الفاروق، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن ندارد، ص 188۔ (۸). ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سولہواں صدر (1861 - 1865) سٹور کیپر، پوسٹ ماسٹر اور بعدازاں فوجی ملازمت سے زندگی کا آغاز کیا۔ 1838ء میں وکالت قانون کا امتحان پاس کیا۔ 1834ء سے 1842ء ریاستی مجلس آئین ساز کارکن رہا۔ 1842ء میں کانگرس کارکن منتخب ہوا۔ 1861 میں ری پبلکس پارٹی کے ٹکٹ پر صدر چنا گیا۔ یکم جنوری 1863ء کو ملک سے غلامی کا خاتمہ کردیا۔ 4 اپریل 1865ء کو فورڈز تھیٹر میں ڈراما دیکھ رہا تھا کہ اداکار جان لکس بوتو نے گولی مار کر ہلاک کردیا

(اردو انسائیکوپیڈیا، ص 871)۔ (۹). ابوالفتح محمد صغیر الدین، ڈاکٹر، " جمہوریت اور اسلام "
ماہنامہ بینات، کراچی، جلد نمبر52، شمارہ نمبر ا محرم الحرام ۱۴۱۰ھ مطابق ستمبر1989ء ص 37۔
(۱۰)(۱۱). تحسین فراقی، ڈاکٹر، " مغربی جمہوریت اہل مغرب کی نظر میں "، مرکز تحقیق دیال سنگھ
ٹرسٹ، لاہور، 1983ء، ص 3۔ (۱۲). زبیر رانا، " پوری دنیا میں جمہوریت کہیں نہیں ہے "
(مضمون) روزنامہ جنگ، کراچی، جمعہ ایڈیشن، مورخہ 29 جولائی 1988ء۔
(۱۳). پاکستان میں جمہوریت کا زوال، ص　　　(۱۴). ول ڈیورانٹ، نشاط فلسفہ ترجمہ ڈاکٹر
محمد اجمل، مکتبہ خاور، لاہور، طبع اول، 1966ء، ص 476۔ (۱۵). فکر اقبال، ص 218۔
(۱۶). محمد اقبال، ڈاکٹر، بانگ درا، الفصل ناشران و تاجران، لاہور، جون 1991ء، ص 201۔
(۱۷). مودودی، مولانا، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ اول، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور،
اشاعت گیارہویں، دسمبر 1984ء، ص 270۔ (۱۸). تھامسن کارلائل (1795 - 1881) ہیرو پرست
انگریز مصنف سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی سے تعلیم پائی، جرمن زبان وادب کا ماہر۔
1837ء تاریخ انقلاب فرانس لکھی، جو بہت مقبول ہوئی۔ کارلائل نے حضور کی سوانح بھی لکھی۔
(انسائیکوپیڈیا ص 771)۔ (۱۹). نشاط فلسفہ، ص473، (۲۰). ایضاً، ص474۔
(۲۱). بانگ درا، ص154۔ (۲۲). مودودی، مولانا، ترجمان القرآن، لاہور، جلد نمبر 44، عدد 6۔
(۲۳). ایضاً۔ (۲۴). صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان تاریخ وسیاست، جنگ پبلیکیشنز لاہور، اشاعت
چہارم، اگست 1992ء، ص (۲۵). ________ (۲۶). سورۃ المائدہ، آیت 3۔
(۲۷). سورۃ الاحزاب، آیت 21، (۲۸). سورۃ النساء، آیت 58،
(۲۹). سورۃ سجدہ، آیت 18۔ (۳۰). سورۃ زمر، آیت 9۔ (۳۱). سورۃ رعد، آیت 16۔
(۳۲). سورۃ مائدہ، آیت 100۔ (۳۳). نشاط فلسفہ، ص469۔ (۳۴). سورۃ النور، آیت 55۔
(۳۵). سورۃ یوسف، آیت 40۔ (۳۶). سورۃ آل عمران، آیت 154۔
(۳۷). محمد بن سعد، علامہ، طبقات ابن سعد، مترجم عبداللہ العمادی، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع
سوم، جنوری 1980ء، ص 53۔ (۳۸). جناب پرویز صاحب شاہکار رسالت، ادارہ طلوع
اسلام لاہور، چوتھا ایڈیشن 1987ء ص 295۔ (۳۹). الفاروق، ص 188۔
(۴۰). محمد حسین ہیکل، عمر فاروق اعظم، ترجمہ حبیب اشعر، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، بار ہشتم
1986ء، ص 590۔ (۴۱). ایضاً۔ (۴۲). شاہکار رسالت، ص 218 کتاب مذکور کے اسی صفحہ نمبر

218 پر حضرت عمرؓ کا وہ خط بھی موجود ہے جو آپ نے عبدالرحمن کی سزا کے ذکر میں حاکم مصر عیاض بن غنم کو لکھا تھا۔ خط کے ایک ایک لفظ سے عدالت عمر کا جلال ٹپکتا ہے۔ مذکورہ خط "حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط" مرتبہ ڈاکٹر خورشید احمد فاروق کے صفحہ 124 پر بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کو محمد علی خان دیوان نے کراچی سے مارچ 1979ء میں شائع کیا۔ محولہ بالا واقعہ کا ذکر جناب محمد حسین ھیکل نے اپنی تصنیف "عمر فاروق اعظم" کے ص 610 پر بھی ہے۔

(۴۳). الفاروق، ص 199۔ (۴۴). ایضاً، ص 200۔ (۴۵). بانگ درا، ص 201۔

(۴۶). محمد اقبال، ڈاکٹر، ضرب کلیم، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1991ء ص ۱ (۴۷). محمد اقبال، ڈاکٹر، دیباچہ پیام شوق، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع اول 1991ء، ص 9۔

(۴۸). ایضاً، ص 248۔ (۴۹). سورۃ الاعراف، آیت 8۔ (۵۰). سورۃ الاعراف، ایت 9

(۵۱). ول ڈیورانٹ، داستان فلسفہ، ترجمہ سید عابد علی، مکتبہ ______، لاہور، ص 44۔ (بحوالہ ڈاکٹر وحید قریشی، اقبال اور جمہوریت، مجلہ اقبالیات، جلد نمبر 26۔ نمبر 4 (جنوری تا جون 1986 ص 114)۔ (۵۲). نشاط فلسفہ، ص 101۔ (۵۳). سورۃ شوریٰ، آیت 38۔

(۵۴). سورۃ آل عمران، آیت 38۔ (۵۵). سورۃ نحل، آیت 43۔

(۵۶). الفاروق، ص 189۔ (۵۷). حامد انصاری، مولانا، اسلام کا نظام حکومت، الفیصل پبلیکیشنگ کمپنی، لاہور، من ندارد۔ (۵۸). عبدالرحمن کیلانی، مولانا، خلافت و جمہوریت، مکتبہ السلام، لاہور، طبع سوم 1992ء۔ (۵۹). مودودی، مولانا، اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور (مرتبہ خرم مراد مرحوم) ایڈیٹر ماہنامہ ترجمان القرآن)۔ (۶۰). پاکستان تاریخ وسیاست، ص 276۔

(۶۱). ایضاً، ص 261۔ (۶۲). فکر اقبال، ص 218۔ (۶۳). احمد سعید (مرتب) گفتار قائد اعظم، قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، طبع اول، جون 1976، ص 2۔

(۶۴). ایضاً، ص 261۔ (۶۵). پاکستان تاریخ وسیاست، ص 291۔ (۶۵). ایضاً۔

(۶۶). ایضاً، ص 311۔

(۶۷). ایضاً

(۶۸). ایضاً۔ (۶۹). ایضاً۔

(۷۰). ایضاً، ص 312۔

جناب ضیاء الدین لاہوری

کیا واقعی سرسید احمد خان دوقومی نظریہ کے بانی تھے؟

پاکستان کا قیام " دوقومی نظریہ " کے نعرہ کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ اگر چہ برصغیر میں آزادی سے قبل دو سے زیادہ قومیں آباد تھیں مگر " دوقومی نظریہ " کی اصطلاح اس وجہ سے استعمال ہوئی کہ اس علاقہ میں ہندواور مسلمان دوسری قوموں کی نسبت واضح اکثریت رکھتے تھے اور دونوں اپنی اپنی جگہ قابل ذکر اہمیت کے حامل تھے۔ یہی دوقومیں اس خطے کے وسیع رقبوں پر حکومت کرنے کی اہل سمجھی جاسکتی تھیں کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں کے مختلف علاقوں میں ہندو راجے اور مہاراجے حکمران تھے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسلمان حملہ آوروں نے ادھر کا رخ کیا اور یکے بعد دیگرے ان کے علاقوں پر قابض ہونے لگے۔ یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ بالآخر انگریز قوم تاجروں کے بھیس میں ہندوستان میں داخل ہوئی اور اپنی حکمت عملیوں سے کام لے کر آہستہ آہستہ عظیم الشان مغل سلطنت کے فرماں رواؤں کو یوں بے بس کردیا کہ بالواسطہ طور پر خود حکمران بن گئی۔ اٹھارہ سو ستاون کے بعدواسطے کا یہ برائے نام سلسلہ بھی تمام ہوا اور اس خطے پر بلاشرکت غیرے انگریزوں کا سکہ چلنے لگا۔

جدید دور آیا اور اقتدار کا مفہوم بدلنے لگا۔ اب تلوار کے زور سے حکومت کرنے کازمانہ ختم ہورہا تھا۔ جمہوریت کے نام پرعددی اکثریت حکمرانی کا حق قرار پانے لگی۔ باوجود یکہ نظم ونسق میں صلاح ومشورہ کے لیے اہل ہند کی نامزدگی کا رواج ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا مگر انگریز حکام خاص حدود کے اندر اکثریت کی بنیاد پر پیش کئے گئے مطالبات کی پذیرائی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے تاکہ بدامنی سے محفوظ رہ کر جس قدر ممکن ہو اپنے دور اقتدار کو طوالت دی جاسکے۔ بااثر ہندوؤں کا ایک طبقہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاکر ایسے منصوبے بنانے لگا جس سے مسلمانوں کے تہذیبی آثار مٹاکر خالص ہندوانہ تہذیب کو رائج کیا جائے۔ ایسی ہی ایک کوشش 1867ء میں کی گئی جب بنارس کے سربرآوردہ ہندوؤں نے اردو زبان اور اسکے فارسی رسم الخط کی بجائے بھاشا زبان اور دیوناگری رسم الخط جاری کروانے کی ایک تحریک شروع کی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے الطاف حسین حالی لکھتے ہیں۔

" سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیر سے، جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کررہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا " اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہی گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا، اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا، مجھے نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔" اسی موضوع پر ۱۸۷۰ء میں سرسید نے لندن سے نواب محسن الملک کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا:

" ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹادیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے سائنٹفیک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے، کہ بجائے اخبار اردو کے ہندی میں ہو تو ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہونگے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہوجائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہوکر اپنا کاروبار کریں تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا او ہندو نقصان میں رہیں گے ، اور اس میں صرف دوامر کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبعیت کے سبب کہ میں کل اہل ہند (کیا ہندو، کیا مسلمان) کی بھلائی چاہتا ہوں۔ دوسرے بڑا خوف اس بات کا ہے کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور ادبار چھایا ہے۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں اور وہ مطلق اپنے نقصان کو نہیں سمجھتے۔ اس پر حسد اور کینہ ان میں بآہبا بہ نسبت ہندوؤں کے اور جھوٹی شیخی زیادہ ہے اور کسی قدر مفلس بھی ہیں۔ ان وجوہات سے وہ ہرگز اس قابل نہیں ہونے کے جو اپنی بھلائی کیلئے کچھ

کر سکیں"۔

زبان ہی کے مسئلے میں ہندوؤں کی متعصبانہ کوششوں کے متعلق ۱۸۸۷ء میں سرسید ایک تعلیمی سروے رپورٹ میں لکھتے ہیں:

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری خواہش یہ تھی کہ دونوں مل کر دونوں فلاح کے کاموں میں کوشش کریں، مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو، جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو و مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے"۔ (۲)

سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی یا حامی قرار دینے کیلئے مذکورہ بالا حوالے ہی بنیاد بنائے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب حوالہ اول میں بیان کردہ واقعہ کو "دو قومی نظریے کی ابتدا" قرار دیتے ہیں۔ (۳)۔ رئیس احمد جعفری سرسید کو "دو قومی نظریے کا اصلی خالق" قرار دے کر ان کی جدوجہد کو "پاکستان کی خشت اول" سے تعبیر کرتے ہیں (۴)۔ صفدر سلیمی انہیں "پاکستان کا معمار اول" گردانتے ہیں (۵)۔ ہمارے بہت سے دوسرے دانشور بھی اسی قسم کا چرچا کرتے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں یہی کچھ لکھا جاتا ہے۔ نصابی کتب کی وساطت سے طلبہ کو یہی تعلیم دی جاتی ہے اور علمی ادبی محفلوں میں بھی یہی کچھ سننے میں آتا ہے۔

سرسید کے الفاظ سے اپنی مرضی کے نتائج نکالنا ہمارے بعض دانشوروں کا کمال بن چکا ہے۔ ان کا فن اصل حوالوں سے بے نیاز ہے۔ مجبوری کی صورت میں سیاق وسباق کو چھپا دیا جاتا ہے۔ یا پھر ان کے مفہوم کو ایسے الفاظ کا لبادہ پہنایا جاتا ہے جس سے دوسروں کو اصل سے متضاد تاثر ملے۔ مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات عیاں ہے کہ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے البتہ اپنے تاثرات کے ذریعے وہ تعصب کی مساعی کی مذمت کرتے ہیں۔ جب دونوں قوموں میں کسی لحاظ سے علیحدگی کا ذکر کرتے ہیں تو دکھ کا اظہار کرتے ہیں، ورنہ وہ ہردم ان دونوں کی برابر ترقی کے خواہاں ہیں۔ ان کے الفاظ اور مفہوم پر اچھی طرح غور کیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اب ہندو و مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے" یہاں ملکی ترقی اور عوامی فلاح کا ذکر ہو رہا ہے مگر ہم نے اپنی تصوراتی اڑانوں سے یہ اخذ کر لیا کہ ان الفاظ میں

ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ہندو اور مسلمان دو مختلف مذہبی معتقدات دو مختلف ادبیات اور دو مختلف النوع معاشرتی اطوار کے ماتحت ہیں۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے ، نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور یہ بھی اصرار کے ساتھ کہے کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ حیات انسانی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی تمنائے ترقیات کے لیے مختلف تاریخوں سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کے اس ذوق وشوق کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ دونوں قوموں کی رزمیہ نظمیں، ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور رہنما دوسری قوم کے بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے، ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی۔"

پاکستان کا دو قومی نظریہ محض اس امر کی وضاحت نہیں تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اس میں غیر ملکی حکمرانوں سے مکمل آزادی بھی مطلوب تھی۔ یہ انگریزوں کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس کا مقصد ان سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس امر میں اس قافلے کے سالار اعلیٰ کے خیالات ملاحظہ فرمائیں جن کا اظہار انہوں نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ۹ نومبر ۱۹۴۲ء کو کیا: "یہ ایک چھوٹا براعظم ہے جس میں مختلف لوگ اور قومیں آباد ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی کسی ایک طاقت نے پورے ملک پر حکومت نہیں کی۔ اور اس زمانہ میں بھی جب کہ برطانیہ آئینی طور سے اس پر حکمران ہے۔ ایک تہائی ہندوستان برطانوی نہیں۔ ہندوستان کی انتظامی وحدت برطانیہ کی پیداکردہ ہے۔ لیکن یہ حکومت جو ۱۵۰ یا ۱۶۰ سال سے یہاں قائم ہے عوام کی منظوری اسے حاصل نہیں۔ یہ ایک جمہوری نظام ہے جسے مغل نظام پر عائد کردیا گیا ہے۔ اسے برطانوی سنگینوں کی حمایت حاصل ہے، عوام کی نہیں۔ اب لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہوچکا ہے۔ ہم اپنی آزادی چاہتے ہیں، ہم اپنی سرزمین کے خود مالک بننا چاہتے اور برطانوی اقتدار کو خیرباد کہنا چاہتے ہیں۔" اس کے برعکس سرسید انگریزوں کی حاکمیت کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے

تھے ۔ وہ تمام عمر اس فلسفہ پر کاربند رہے کہ " ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے ۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی جس کے سایہ عاطفت میں ہم امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں ، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے ۔ " اپنی وفات سے صرف چھ ماہ قبل سرسید نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا کہ " ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیرخواہ اور وفادار رہیں ۔ اور کوئی بات قولاً وفعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو ۔ " اس کے جواز میں وہ مذہبی اسناد بھی پیش کیا کرتے تھے ۔ اس مضمون کی اشاعت کے ایک ہفتہ بعد وہ ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں :

" حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول خدا نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو خواہ تمھارے ساتھ ظلم وستم ہوتا ہو یا وہ انصاف اور مروت سے پیش آتے ہوں ۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے ، جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس مذہب کا ہو ۔ " اطاعت اور وفاداری کے اس جذبے میں وہ مظلوم کو آہ کی بھی اجازت نہیں دیتے ۔ وہ ایڈیٹر پایونیر کے نام ایک مکتوب میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہ " اگر بالفرض گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے کچھ دست اندازی بھی ہو تو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں ، نہ کہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں بغاوت اختیار کریں "

اپنی تفسیر القرآن میں اس امر کی مذہبی سند انھوں نے یوں پیش کی ہے : " جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمنا اقرار کیا ہو اور گو بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی ۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں ۔ " کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی اطاعت اور ان سے غیر مشروط مفاہمت کی یہ حکمت عملی سیاسی مصلحتوں کے تابع تھی اور سرسید اس طرح مسلمان قوم کو آزادی کے لیے تیار کر رہے تھے ۔ دوسرے الفاظ میں وہ انگریز قوم کو بے وقوف ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو ان کی یہ چالاکی نہ سمجھ سکی ۔ ساری دنیا میں انگریزوں کی سیاسی دور اندیشی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ امر ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی تحریک کی مالی اور سیاسی سرپرستی کرتے جو بالآخر انہی کے زوال پر منتج ہوتی اور اس طرح وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ۔ ہندوستان میں انگریزوں کی ساری تاریخ ان دلائل کی نفی کرتی ہے ۔ سرسید کی پالیسی ان کی اپنی سمجھ کے مطابق اخلاص پر مبنی تھی ۔ ان کی خواہش تھی کہ " ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل)

(Eternal) ہونی چاہئے ۔" حیرت ہے کہ واضح حقائق کی موجودگی کے باوجود بعض اہل قلم تحریک آزادی کے ذکر میں ان لوگوں کو بھی ہیرو بنا کر پیش کر دیتے ہیں جنہوں نے آزادی کی روح کو کچلنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور دامے درمے، قدمے، سخنے عوام کی غلامانہ زندگی کو طوالت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ۔ متعدد معروف مصنفین کی تحریروں کے علاوہ اس کی ایک مثال آج ہم جی الانا کی انگریزی کتاب " ممتاز مسلمان مجاہدین آزادی " میں دیکھتے ہیں ۔ جس میں سرسید احمد خان بہادر کو جہاد آزادی کے ایک قابل ذکر رہنما کے طور پر پیش کیا گیا ہے ۔ دراصل سرسید کو سن ستاون کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی حالت زار نے اس پالیسی کو اپنانے پر مجبور نہیں کیا بلکہ وہ اس سے کئی سال قبل سے ہی اس نظریے پر کارفرما تھے ۔ ایڈیٹر پایونیر کے نام اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ " جو میری آرا اور خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت ہیں ان کے اصول میرے بیٹے سید محمود کی پیدائش سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے ۔" واضح ہو کہ سید محمود کا سن پیدائش ۱۸۵۰ء ہے ۔ اس کے علاوہ ۱۸۹۴ میں انہوں نے انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری کے جذبات کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ " میری یہ رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں ۔"

سرسید کے مندرجہ بالا بیانات کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ پالیسی انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر اختیار کی ۔ مضحکہ خیز ہے ۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ اس صورتحال نے ان کے عزائم کو تقویت پہنچائی اور ان کے لیے مسلمان قوم کی قیادت سنبھالنے کی راہ ہموار کی ۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ کثیر الاقوام معاشرے میں کسی مذہب کے پیروکار اکثر و بیشتر اپنے ہم مذہب سیاسی قائدین کی تقلید کو ترجیح دیتے ہیں ۔ جیسا کہ سرسید نے خود بیان کیا ہے کہ

" برٹش رول (Rule) کے ساتھ میری وفاداری اور محبت کی آزمائش ۱۸۵۷ء کے مصائب میں ہوئی تھی ۔ انگریزوں کا سند یافتہ خیر خواہ ہونے کے باعث انہیں حکمرانوں کی طرف سے مکمل تعاون اور اعتماد حاصل تھا ۔ اسی رسوخ کی بدولت وہ قوم کو ایک خاص عرصے تک اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب ہوئے ۔ بقول حالی " اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی اصل سبب ان کی راست بازی اور سچائی ٹھہرے گی کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں نیٹو (Native) کا اس قدر رسوخ اعتبار پیدا کرنا، جب تک کہ اس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر تایا نہ گیا ہو ہرگز ممکن نہیں ۔" انہوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ انگریزی حکومت کے استحکام کی کوششوں میں حصہ لیا جو اصلاحی کارنامے انجام دیئے ان کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا ۔

انکی مساعی کا تحریک پاکستان سے ناطہ جوڑنا حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ دو قومی نظریہ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ثبوت کے طور پر مزید حوالے ملاحظہ ہوں:

"اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل وکرم سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب وہوا کے شریک ہیں، ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج وراحت کا شریک ہوتا ہے، ایک دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں ...... پرانی تاریخوں میں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں

یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک ہی قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گوان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو، کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پہ جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔" تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں "قوم" کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ پسند نہیں کرتا"۔

بعض قلم کار علی گڑھ کالج کے قیام کو دو قومی نظریے کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ غالباً اس سے وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کالج صرف مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مختص تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے قبل ہندوؤں کے نام پر بھی تعلیمی ادارے موجود تھے، یہاں تک کہ بنارس ہندو یونیورسٹی قائم ہوگئی، مگر ان کے وجود کو کسی نے دو قومی نظریے کی بنیاد قرار نہ دیا۔ دراصل مختلف قوموں کے نام پر قائم کیے گئے اداروں میں ہر قوم کے افراد تعلیم پاتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ پھر ان قوموں نے الگ الگ قوم کی نام پر مدرسے کیوں قائم کیے؟ اس کا جواب سرسید کے مندرجہ ذیل بیان سے اخذ کیا جاسکتا ہے:

"مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ ترقی قومی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف

مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کی درست کرنے کیلئے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سائنسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی، اس کے رفع کرنے کو قائم کیا گیا مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔" اس کے جواز میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی:
ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پائیں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پائیں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کیلئے موجود نہ کیے جائیں، ہماری عزت نہیں ہوسکتی۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا۔" ایک اور موقع پر سرسید نے اس مطلب کو یوں بیان کیا:
"مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روزبروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جاسکتی ہے: فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقت ور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قائم کرنے میں آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کرسکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔" صرف یہی نہیں، جہاں مسلمان طلبہ کی ہمت افزائی کیلئے کسی جانب سے کوئی امتیاز سلوک کیا گیا تو انہوں نے اپنی جانب سے ہندو طالب علموں کو بھی اسی سلوک کا مستحق

قرار دیا۔ ان کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس اس صورت حال کی وضاحت کرتا ہے:

" امرت سر (پنجاب) کے چند مسلمانوں نے یہ پیش کش کی ہے کہ ہمارے کالج جو مسلمان طالب علم بی اے کے آئندہ امتحان میں اول درجے میں کامیاب ہوگا اسے طلائی تمغہ عطا کیا جائے گا۔

میں اس ہندو طالب علم کو جو بی اے کے آئندہ امتحان میں اول درجے میں کامیاب ہوا اسے اپنی جیب سے طلائی تمغہ کی پیش کش کرتا ہوں۔" سرسید کی نگاہوں میں دونوں قومیں مساوات کے جس اعلیٰ مقام کی حقدار تھیں اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

" میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے مگر میں ہندو اور مسلمانوں دونوں کو بطور ایک آنکھ سے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میرے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں عمدگی کے ساتھ انکو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہہ دے سکتا۔"

پاک بھارت سرحد کی دونوں جانب سرسید کے شیدائی کثیر تعداد میں بستے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں سرسید کے تصور قومیت کا ذکر اپنے اپنے ملکی نظریات کے مطابق کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں انہیں دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا جاتا ہے تو سرحد پار کے باسی انہیں متحدہ قومیت کا علمبردار بتاتے ہیں۔ ہمارے مصنفین کی تحریروں میں اس اختلاف کا ذکر بوجوہ نہیں ملتا مگر بھارتی مصنف اکثر اس کی نشان دہی کردیتے ہیں۔ سرسید کے نظریے سے اتفاق یا اختلاف اپنی جگہ پر مگر ہر انصاف پسند ان کے تجزیے کو درست ماننے پر مجبور ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں:

" سرسید کی فکر کا ایک نہایت ہی اہم پہلو ان کا تصور قومیت ہے۔ انہوں نے دو بنیادی حقیقتوں کو اس سلسلے میں بار بار دہرایا ہے۔ ایک یہ کہ قوم مذہب سے نہیں بنتی، دوسرے یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ پہلے نظریہ کہ پرزور تائیدان کے انتقال کے ۴۰ سال بعد دیوبند سے ہوئی جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے اعلان کیا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں اور علامہ اقبال نے اس کی پرزور تردید کی۔ غالباً آج بھی متحدہ قومیت کا تصور اس سے آگے نہیں پہنچا جہاں سرسید نے پہنچادیا تھا۔"

اور اب آخر میں علی گڑھ سے شائع ہونے والی سرسید کی ایک تصنیف میں درج انتساب کے الفاظ جن سے اگر عقیدت کے تاثر کو الگ کردیا جائے تو قومیت کے مسئلے پر سرسید کے خیالات کے صحیح ترجمان ہیں: " سرسید کی روح کے نام جس نے ہندوستانیوں کو متحدہ قومیت کا تصور بخشا"۔
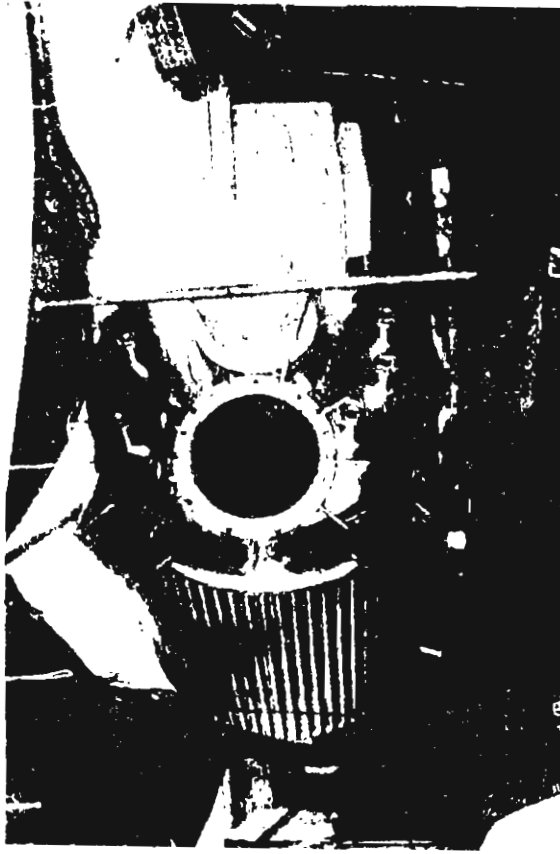
ریزن ری ایکٹر
سٹین لیس سٹیل میں

ہماری مصنوعات : پراسس پلانٹ اکوپمنٹ مینوفیکچرنگ
الکڈ ریزن پلانٹ ۔ پی ۔ وی ۔ اے پلانٹ
ڈی ۔ او ۔ پی پلانٹ ٹرن کی بنیادوں پر (ایس ۔ ایس ۳۱۶ میں)
علاوہ ازیں ہر طرح کی ڈیولپمنٹ کا کام بھی کیا جاتا ہے ۔

تیارکنندگان : حامد انجینئرنگ کمپنی نور روڈ بادامی باغ لاہور (پاکستان)

فیکٹری فون :- ۴۲۸۴۳۷۶ ۔ ۴۲۸۰۸۸۱ رہائش فون :- ۵۸۶۴۲۱۸

جناب پروفیسر محمد افضل رضا صاحب
اکوڑہ خٹک

تحریک آزادی کا پہلا میدان کارزار اکوڑہ خٹک

وادی گندھارا کا قدیم ترین قصبہ اکوڑہ خٹک اگرچہ اکوڑخان (۹۸۹ھ پ) (دور اکبری) کے نام سے موسوم ہے۔ جو صاحب سیف و قلم خوشحال خان خٹک کا جد امجد تھا۔ لیکن غزنوی اور غوری ادوار میں اسے سرائے حیثیت حاصل تھی۔ وسط ایشیا سے تجارتی مال و اسباب لیکر درہ خیبر کے راستے پشاور میں داخل ہوتے اور قیام کرنے کے بعد برصغیر میں وارد ہونے کیلئے اٹک کے مقام سے کچھ فاصلے پر قائم دریائے کابل اور پہاڑوں کے درمیان اسی تاریخی سرائے میں قیام کرتے تھے۔ اکوڑہ خٹک اب تک سرائے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلکہ حال ہی میں اکوڑہ خٹک میں واقع عمرا خان غونڈئی سے گوتم بدھ کے بتوں کی برآمد سے یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ یہ سرائے قبل مسیح زمانے کی ہے۔ جو اپنی قدامت اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے مزید تحقیق کا تقاضا کرتی ہے۔

(۱). دور اکبری:-

تحریک آزادی میں فرزندان اکوڑہ خٹک کے تاریخی کردار کا جائزہ لیتے وقت سب سے پہلے موجودہ اکوڑہ خٹک کے بانی اکوڑ خان کی شجاعت پر نظر پڑتی ہے۔ جنہوں نے علاقہ چراٹ میں آباد ہندو جوگیوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا، کیونکہ وہ اسلام کے خلاف منافرت پھیلانے میں مصروف تھے۔ اور اکبر کی نرم مذہبی پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کفر و شرک کی اشاعت اپنا فریضہ اول سمجھتے تھے۔ ایک بار اکبر نے اکوڑخان خٹک سے ایسے ہندوؤں کی تعداد کے بارے میں پوچھا جنہیں مذہبی جمعیت کی وجہ سے آپ نے قتل کیا تھا تو آپ نے جواب دیا "شمار معلوم نہیں۔ البتہ ایک طرح سے حساب لگایا جاسکتا ہے وہ یہ کہ ان کے کان میں جو بالی ہوتی تھی، قتل کرنے کے بعد وہ بالی اتار کر میں مٹکے میں رکھ دیتا تھا، اور اس طرح ان سے دو بڑے مٹکے بھر گئے۔ اکوڑ خان پہلے ان جوگیوں کو دعوت اسلام دیا کرتا تھا۔ اگر دعودت رد کردی جاتی تو انہیں قتل کر دیا جاتا تھا" (۱)

---

(۱). پشتون کون۔ پروفیسر پریشان خٹک (ص ۳۲۷ / ۳۲۸)

(ب). دور شاہجہانی:۔

شاہجہانی دور حکومت میں یہاں حضرت شیخ المشائخ قطب الاقطاب شیخ ارخ الدین سلجوقیؒ کا سلسلہ رشدوہدایت جاری تھا۔ دینی علوم میں حضرت شیخ قطب الاقطاب حضرت شیخ رحمکار کاکاصاحبؒ کے استاد تھے۔ لیکن طریقت میں آپ ان کے مرید تھے۔ ۱۰۷۴ھ میں اکوڑہ خٹک میں وفات پائی۔ آپ کا مزار مرجع خاص وعام ہے۔ شاہجہانی دور میں صاحب سیف وقلم خوشحال خان خٹک نے مذہبی اور اسلامی جذبہ جہاد کے تحت ۱۶۴۲ء میں مہم کانگرہ میں مغل حکومت کے باغی راجہ جگت سنگھ کے خلاف تلوار اٹھائی اور اسے شکست دیکر قلعہ تاراگڑھ فتح کیا۔ اسی مغلیہ دور حکومت میں شیخ یٰسین افغانؒ کی اولاد میں حضرت شیخ سلیمان صاحبؒ اور حضرت ملاحسین صاحبؒ کفروشرک کے خلاف اسلامی تعلیمات کی تبلیغ وتدریس میں مصروف رہے۔ مانکی شریف کا مشہور علمی اور روحانی پیرخاندان اور اکوڑہ کے مشہور عالم دین قاضی امین الحق صاحبؒ اور دیگر قاضی خیل اور ملایان خاندان وغیرہ آپ کی اولاد میں شامل ہیں۔ مغلیہ دور میں خوشحال خان خٹک کے برادخورد قطب الاقطاب فقیر جمیل بیگ صاحبؒ بھی تبلیغ اسلام اور رشدوہدایت میں مصروف رہے۔ آپ شیخ رحمکاریہ کاکا صاحبؒ کے مرید خاص اور خلیفہ مجاز تھے۔

(ج). دور احمدشاہ ابدالی:۔

احمدشاہ ابدالی کے زمانے میں جب مرہٹوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ تواحمدشاہ ابدالی نے جنگ حسن ابدال میں مرہٹوں کا مقابلے کرنے کیلئے سرداران اکوڑہ خٹک کو بھی روانہ کیا۔ سردار اکوڑہ خوشحال خان ولد سعداللہ خان خٹک حسن ابدال کے مقام پر مرہٹوں کے خلاف بہادری کے جوہردکھاتا ہوا شہید ہوا۔ بعد میں سعادتمندخان اکوڑہ بھی جنگ میں شامل ہوا۔ آپ نے بہادری اور شجاعت کے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ احمد شاہ ابدالی نے خوش ہوکر جہلم تک کی حکمرانی سعادتمندخان خٹک کو بخشی۔ پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) میں احمدشاہ ابدالی نے آپ کی شجاعت اور دلیرانہ کارکردگی کے پیش نظر آپ کو سرفراز خان کا خطاب بخشا۔

تحریک آزادی کی ابتداء

(د). سکھوں کا دور حکومت:۔

امام الہند شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تعلیمات سے فیض یاب جانشین حضرت عبدالعزیز صاحبؒ نے برصغیر کے مسلمانوں میں نئی روح پھونکنے کیلئے جس مبارک تحریک کی بنیاد ڈالی تھی، اس کا

موثر ترین اظہار سید احمد شہید بریلویؒ (۱۷۸۶ء / ۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی زیر قیادت ہوا۔ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو سفر جہاد اختیار کیا۔ اس وقت آپکے ہمراہ پانچ چھ ہزار ہندوستانی مجاہد تھے۔ جنہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے اور مسلمانان پنجاب وسرحد کو مذہبی آزادی دلانے اور اسلامی شریعت نافذ کرنے کا پختہ عزم کیا۔ بریلی سے گوالیار، ٹونک، اجمیر، مارواڑ، حیدر آباد، شکارپور، بولان، قندھار ہوتے ہوئے کابل افغانستان پہنچ گئے، اور وہاں سے آپ خیبر کے راستے پشاور میں وارد ہوکر نوشہرہ پہنچے۔

رئیس اکوڑہ امیرخان خٹک ـــ بیعت ودعوت جہاد:۔

جب ۱۸۲۶ء میں سفر جہاد کے سلسلے میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اپنے مجاہدین کے ہمراہ کابل سے پشاور پہنچے۔ وہاں دو تین روز قیام کرنے کے بعد ہشت نگر چارسدہ تشریف لے گئے۔ اور لشکرگاہ قائم کی۔ تو اس دوران اکوڑہ خٹک کا رئیس امیرخان خٹک ملاقات کیلئے پہنچا اور شرف بیعت سے مشرف ہوا۔ اور ساتھ ہی عرض کی کہ بدھ سنگھ بڑے لشکر کے ساتھ اکوڑہ خٹک پہنچ گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ یہاں سے کوچ فرمادیں اور اس کو وہیں روک لیں۔

اکوڑہ خٹک ـــ کی سرزمین پر پہلا معرکۂ حق وباطل:۔

جنگ شروع کرنے سے پہلے آپ نے دربار لاہور کو ایک تحریری اعلام نامہ حسب قاعدہ شریعت بھیجا لیکن دربار لاہور نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ جرنیل بدھ سنگھ کو ایک بڑا لشکر دے کر مجاہدین کے مقابلے کیلئے بھیجا۔ سب سے پہلا معرکہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ سے سات آٹھ میل کے فاصل پر اکوڑہ خٹک کے مقام پر ہوا۔ اس میں مجاہدین کامیاب رہے، اور بدھ سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا (۱)۔ انگریز مؤرخ بھی اس سرزمین پر مجاہدین کی شجاعت کے گواہ ہیں۔ دی پٹھان کے مصنف اولف کررلکھتے ہیں۔ " سید احمد نے سب سے پہلے سکھوں کی اس طاقتور فوج کا سامنا کیا، جو بدھ سنگھ سندھا نوالیہ کی سرکردگی میں اکوڑہ بھیجی گئی تھی۔ سکھ کمانڈر نے دانشمندی سے کام لیکر اکوڑہ اور جہانگیرہ کے درمیان شیدو کے مقام پر مورچے بنالیئے تھے۔ جہاں سے سکھ فوج قبائل کے پرجوش حملے روکتی رہی۔ لیکن اسے سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا یہاں تک کہ لڑائی زوروں پر تھی تو خود بدھ سنگھ بھی مارا گیا" (۲)۔

---

(۱). موج کوثر۔ شیخ محمد اکرم ص ۳۵۔ (۲). پٹھان۔ اردو ترجمہ ص ۴۲۳۔

جنگ اکوڑہ کے شہداء :-

تاریخ کتب کے اعداد وشمار کے مطابق اس جنگ میں حریف فوج سات ہزار افراد پر مشتمل تھی جبکہ مقابلے میں مجاہدین کی تعداد سات سو تھی ۔ جس میں پانچ سو ہندوستانی اور دوسو قندھاری اور مقامی مجاہدین شامل تھے ۔ راہ حق میں اس سرزمین پر دشمنان اسلام کے ہاتھوں شہید ہونے والے مجاہد شیخ باقر علی صاحبؒ تھے ۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ (مطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء) چہارشنبہ اور پنج شنبہ کی درمیانی شب کو اس معرکے میں ہندوستانی مجاہدین میں سے چھتیس اور قندھاریوں اور مقامی مجاہدین میں تقریباً پنتالیس شہیداور دونوں میں سے تیس چالیس مجاہدین زخمی ہوئے ۔ سات سو سکھ مارے گئے ۔ اکوڑہ خٹک کی سرزمین پر حق کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے والے تحریک آزادی کے متوالوں اور شمع حریت کے پروانوں میں مندرجہ ذیل شہداء شامل ہیں ۔

(۱). شیخ باقرعلی عظیم آبادی (۲)۔ اللہ بخش مورانوی (ضلع اناؤ) (۳). عبدالمجید خان ، جہان آبادی ،(۴). شمشیر خان جھدارمورنوی (۵). شیخ بدھن (۶). شیخ رمضان مورانوی (۷). شیخ ہمدانی خالص پوری صلیح آبادی (۸). علی حسن گشتوی (نزدتانکپور)(۹). غلام حیدرخان خالصپوری (ضلع لکھنو) (۱۰). غلام رسول خان خالصپوری (۱۱). خدابخش خان (بمبئی)(۱۲). شادل خان خیرآبادی (۱۳). کریم بخش خان بذھانوی (روہلکھنڈ) (۱۴). کریم بخش مسجد فتح پوری (۱۵). میاں جی احسان اللہ بڑھانوی (۱۶). شیخ معظم جگہ پٹ پوری (ضلع پرتاب گڑھ) (۱۷). دین محمدؒ کورہرستانوی (بیواڑہ اودھ) (۱۸). عباداللہ (موضع اعظم گڑھ)(۱۹). قاضی طیب (۲۰). امام خان خیرآبادی (۲۱). اولاد مادہری (۲۲). ہمایوں بیگ لکھنوی (۲۳). امام الدین خان رامپوری (۲۴). سید محمد لوہاروی (ضلع مظفرنگر) (۲۵). محمد کمال حزم پوری (۲۶). فہیم خان دین پوری (ضلع مظفر نگر) (۲۷). سید عبدالرحمان شیاملی (ضلع مظفرنگر) (۲۸). شیخ مخدوم مسجد فتحپوری (دہلی) (۲۹). غلام نبی خان گوالیاری (۳۰). عبدالرازاق دیوبندی (۳۲). جواہرخان لکھنوی (۳۲). منورخان ملیح آبادی (۳۳) عبدالجبار مورانوی (۳۴) سیدعبدالرحمان سندھی(۳۵). حسن خان سندھی (۳۶) اکبرخان خالصپوری (۱)۔

---

(۱). دعوت وعزیمت ۔ از مولانا سیدابوالحسن ندوی ۔ حصہ ششم جلد ۱ (ص ۵۲۴ / ۵۲۵)

اس جنگ میں اکوڑہ کے مقامی شہداء میں حضرت حسن الدین شیخ صدیقی اور شیخ مرتضیٰ صدیقی کے اسماء گرامی بڑی تدقیق اور تحقیق کے بعد بحوالہ برادرم طاہر احمد سعید صاحب صدیقی راقم الحروف کو معلوم ہوسکے۔ تاہم جو مزارات شہداء اب بھی اکوڑہ میں موجود ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ (۱). بادو بابا (نزد ایوب آباد) (۲). چکنی بابا (کشی اکوڑہ) (۳). شیخ بابا (نزدخانہ حاجی عزیزاللہ محلہ فرید خان) (۴). چنے بابا (خانہ حنیف گل، محلہ فریدخان) (۵). شہید بابا (خانہ عثمان گل محلہ فریدخان) (۶). شہید بابا (خانہ عجیب الرحمان کسکر محلہ شکورخان) (۷). شہید بابا (پشت خانہ صد بیداد شیرافضل خان محلہ شکورخان) (۸). شیخ مرتضیٰ صدیقی (باغیچہ عمراخون محلہ قریشیان (۹). شیخ حسن الدین صدیقی (شیدو) (۱۰). گودرشاہ بابا نزد دریائے لنڈا (۱۱). شہید بابا نزد خانہ مصباح الدین محلہ شکور خان (۱۲). شہید بابا (نزد خانہ عزیز الرحمان محلہ شیخ صدیقی) (۱۳) شہید بابا نزد خان بابو احسان الہیٰ محلہ شیخ صدیقی) (۱۴) شہید بابا (نزد ریلوے لائن، قرب چاہ مولانا فضل من اللہ (۱۵). شہید بابا (نزد غرقہ کندہ اکوڑہ صحرا) (۱۶). مبارک شاہ بابا (نزد گودرشاہ بابا) (۱۷). شہید بابا (نزد مڈل سکول اکوڑہ خٹک محلہ لکے زئی محلہ اکوڑہ کسی کے بہت سے مزارات جدید تعمیراتی دور کی نذر ہوچکے ہیں۔

جنگ اکوڑہ کا اثر:۔

سرزمین اکوڑہ خٹک پر حق وباطل کے اس معرکے کے اثرات کے بارے میں مولاناسید ابوالحسن ندوی تاریخ دعوت وعزیمت میں یوں رقمطراز ہیں: "اس جنگ کا اثر مسلمانوں اور مخالفین پر خاطر خواہ ہوا۔ مسلمانوں کے دل بڑھ گئے اور حوصلے بلند ہوئے۔ دربار لاہور کی بھی آنکھیں کھلیں۔ ملکی سردار جوق درجوق آکر مبارک باد دینے لگے۔ (۱)۔

بیعت جہاد اور مشائخ ورؤسا:۔

جن مشائخ اور قومی مشاہیر نے جنگ اکوڑہ خٹک کی کامیابی کے موقع پر سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ انمیں حضرت سید محمد امیر صاحب المعروف بہ کوٹے حضرت صاحب، حضرت گل باباقادری، حضرت اخوندحافظ عبدالغفور صاحب سواتی، خان احمد خان کمال ہوتی مردان، شادی خان درانی (ہنڈ) خان محمد اشرف خان مندنڑ زیدہ) ارباب فیض اللہ خان مہمند (پشاور)، ارباب بہرام خان خلیل (تہکال) خان محمد خان (شاہی) خان امیرمحمد خان باجوڑی، خان فتح خان خدوخیل (پنجتار) خان امیرخان خٹک، رئیس اکوڑہ، خان مقرب خان خدوخیل پنجتار شامل ہیں (۲)

---

(۱). تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ ششم جلدا (ص ۵۲۴ / ۵۲۵)۔

(۲). اولیائے پاکستان قاضی عبدالحلیم اثر (ص ۸۷۰ / ۸۷۱)

ان قومی سرداروں ، علماء اور مشائخ کے اثر رسوخ ، دعوت اور تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وادی پشاور کے یوسفزئی ، مندنڑ خٹک ، مہمند ، داودزئی ، ترکلائی ، گگیانی ، ماموم زئی وغیرہ قبائل جہاد کیلئے تیار ہوئے اور جمعیت کی شکل اختیار کی ۔ " شادی خان درانی کے مشورے کے مطابق سید صاحبؒ نے قلعہ ہنڈ (ضلع صوابی) کو جہاد کا مرکز بنایا ۔ (۱) ۔

اکوڑہ خٹک کے یسین خیل خاندان کا انگریزوں کے خلاف جہاد :۔

اکوڑہ خٹک کے مشہور یسین خیل خاندان میں شیخ ضیاء الدین بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں ۔ جن کا شجرہ نسب : شیخ ضیاء الدین ابن بدرالدین ابن محمد ابراہیم ابن اکرم بیگ ابن فتح محمد ابن محمد یوسف ابن یسین مختلف تاریخوں میں درج ہے ۔ بقول مؤلف اولیائے پاکستان قاضی اثر شیخ محمد یوسف میرنی باباکے نام سے مشہور ہیں ۔ آپ کا مزار موضع بڑانگ میں مرجع خلائق ہے (اولیاء پاکستان صفحہ ۹۹۸) ۔ اکوڑہ کے اسی خاندان میں جہاں علماء مشائخ گزرے ہیں ، اور یسین خیل قاضیان اور ملایان کی حیثیت سے زیادہ تر افراد درس وتدریس کے پیشے ئے وابستہ رہے ہیں ۔ بلکہ اب تک وابستہ ہیں ۔ آج سے تقریباً تیس سال قبل اسی خاندان کے ایک بزرگ اکوڑہ خٹک کے مشہور مدرس جناب صاحب زادہ صاحبؒ نے راقم الحروف کو ملاقات میں بتایا تھا کہ اس قبیلے کے بعض گھرانوں کے افراد سے حضرت استاد شیخ ضیاء الدین اور ان کے فرزند حضرت مولانا شیخ عبدالوہاب صاحب المعروف بہ پیرصاحب مانکی شریف جو انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد میں مصروف تھے ۔ مجاہدین کیلئے بارود اور کمان تیار کروایا کرتے تھے ۔ اس لیے بعض گھرانے داروگر اور کمان گر بھی مشہور ہوئے ۔ الغرض سکھوں کے مظالم سے تنگ آکر ان دونوں حضرات نے اکوڑہ سے ہجرت کی ۔ ۱۲۵۰ھ میں شیخ ضیاء الدین صاحبؒ بدرشی منتقل ہوئے ، وہاں تلقین جہاد کے ساتھ ساتھ جامع مسجد میں علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف رہے ۔ آپ کا مزار اکوڑہ خٹک میں شیخ سلیمان باباؒ قبرستان میں مرجع خلائق ہے ۔ آپ کے فرزند حضرت شیخ عبدالوہاب صاحب المعروف پیرصاحب مانکی شریف (۱۲۲۲ھ / ۱۳۲۲ھ) سیدو شریف کے حضرت غوث الزمان کے مرید تھے ۔ اور اپنے پیرطریقت کے ساتھ ۱۸۶۳ء میں امبیلہ (سرکاوی) کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے ۔ ۱۸۹۵ء میں مالاکنڈ کے مقام پر انگریزوں کے خلاف مصروف جہاد رہے ۔ قیام پاکستان کیلئے آپ کے نواسے جناب امین الحسنات پیرصاحب مانکی شریف کی خدمات اظہر من الشمس ہیں ۔

---

(۱) تاریخ یوسفزئی ۔ اللہ بخش یوسفی (ص ۳۵۸)

رئیس المجاہدین حاجی صاحب ترنگزئی اکوڑہ خٹک میں :-

تحریک آزادی کی صف اول کے مجاہد جناب سید فضل واحد الملقب بہ حاجی صاحب ترنگزئی انگریزوں کے خلاف معرکوں میں پشتون قوم کی رہنمائی اور قیادت کرتے رہے اور ساتھ ہی معاشرتی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا ۔ آزادمدرسوں کا جال بچھایا ۔ غیر اسلامی طور طریقوں اور رسم ورواج کی بیخ کنی میں مصروف رہے ۔ آپ اسی مشغلے میں ۱۹۰۴ء اور ۱۹۱۳ء میں اکوڑہ خٹک تشریف لائے ۔ معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں کو فرنگی استعمار کے خلاف بزدآزما ہونے کی دعوت بھی دیتے رہے ۔

تحریک ہجرت اور اکوڑہ خٹک کے مہاجرین :-

انگریزسامراج کے مظالم جب تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے نتیجے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے تو ہندوستان کے مولانا عبدالباری نے ۱۸۶۵ء میں جاری کردہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتوے کی روشنی میں ہندوستان کو دارالحرب قراردیا ۔ علمائے کرام اور پیران عظام نے لوگوں کو ترک وطن پر آمادہ کرنے کی تحریک شروع کی ۔ مئی ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی اور اس کے رفقاء نے وائسرائے ہند کو چیلنج دیا کہ اگر مسلمانان ہند کے مطالبے ایک ماہ تک منظور نہ کئے گئے تو ہندوستان کے مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہوجائیں گے ۔ اور افغانستان چلے جائیں گے ۔ ان دنوں اعلیٰ حضرت امان اللہ نے بھی جذباتی تقریر کی جو روزنامہ " امان افغان " میں نطق ہمایون کے عنوان کے تحت شائع ہوئی ۔ اس میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (میراحمد خیل یوسفزئی) کے مطالبات اور ہجرت کے چیلنج کا ذکر تھا ۔ غازی امان اللہ نے اس میں یقین دلایا تھا کہ افغانستان اپنی پوری ستطاعت کے ساتھ اس قسم کے مہاجرین کی خدمت کیلئے تیار ہے ۔ اس تقریر نے مسلمانان ہند میں نیاجوش پیدا کیا اور اعلان ہجرت کیا ۔ جون ۱۹۲۰ء میں جابجا ہجرت کمیٹیاں قائم کی گئیں ۔ صوبہ سرحد کے گوشے گوشے سے مہاجرین کے قافلے بیل گاڑوں ، پاپیادہ اور باربردار جانوروں کے ذریعے سوئے افغانستان روانہ ہوئے ۔ اکوڑہ خٹک سے جن افراد نے اپنی بیل گاڑیوں میں پشاور تک سفر کیا اور بعدازاں پیدل کابل پہنچے ، ان میں زینورشاہ بابا (محلہ عادل ذات) باچاگل (محلہ حاجی رحمان الدین) سید احمد (محلہ شکور خان) غلام جیلانی (محلہ قصابان) اور بہت سے دوسرے حضرات شامل ہیں ۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ کے والد محترم جناب الحاج معروف گل صاحبؒ نے

مہاجرین کیلئے بیل گاڑی خریدی تھی۔

خدائی خدمت گار تحریک اور اکوڑہ خٹک :-

۱۹۲۴ء میں باچاخان نے قید سے رہائی کے بعد پشتون قوم کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاحی مہم کی ابتداء کی۔ اور انجمن اصلاح افاغنہ قائم کی۔ بیرسٹر میاں احمدشاہ اور پشتو کے آتش نواشاعر محمد اکبرخادم نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خادم صاحب اکوڑہ کے مشہور قبیلے "قریشیاں" سے تعلق رکھتے تھے۔ آزادی کے بارے میں آپ ہی کے مشہور زمانہ پشتو شعر ہے:

نه کلونه دغلام   په غلامی کښې   نه ساعت دآزادئ که ځنکدن وی

ترجمہ :- نہ غلامی میں غلام کے سالہاسال ۔ نہ لمحہ آزادی اگرچہ جانکنی کا لمحہ ہو۔

انجمن اصلاح افاغنہ اور افغان یوتھ لیگ نے ۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء کو خان عبدالغفار خان اور دیگر رہنماؤں کے مشورے سے خدائی خدمتگار تحریک کی شکل اختیار کی۔ ۲۲ اگست ۱۹۳۰ء کو اس تحریک کا حلف نامہ مرتب ہوا۔ برصغیر کی آزادی کے سلسلے میں اس تحریک نے جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ ہماری تاریخ میں روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اکوڑہ کی جن سیاسی شخصیتوں نے خدائی خدمتگار تحریک اور بعد میں سرخپوش تحریک وکانگریس میں نمایاں کرداد ادا کیا، ان میں قاضی ظہیرالدین، سیف الحق صدیق، قاضی عبدالودود، چاچا غلام ربانی، غلام خان کشمیری وکانگریس، عبدالحمید کشمیری، ماسٹر نورالبصر، قاضی شمس الحق، قاضی شریف اللہ، سیدنور بادشاہ اور بعد میں باچاخان کے قریبی ساتھیوں میں جناب اجمل خٹک، حاجی محمد آثم، حیاگل جرنیل، شیرین خان، رحیم بخش اوردیگر حضرات شامل ہیں۔

اکوڑہ خٹک پر انگریزی فوج کا حملہ :- برطانوی سامراج نے ۱۹۳۱ء میں بنگال، صوبہ جات متحدہ اور شمال مغربی صوبہ میں جس طرح ظلم وتشدد کا بازار گرم رکھا۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ حالانکہ لندن میں نومبر ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس ہورہی تھی اور صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں کے دفتروں پر چھاپے پڑ رہے تھے۔ ان کے مشہور رہنما پابہ زندان تھے۔ ان کے گھروں کی بے حرمتی کی جارہی تھی، تاکہ آزادی کے متوالے آزادی کا مطالبہ نہ کریں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو گورا فوج اور ملیشیا نے خدائی خدمتگاروں کے دفتر واقع مکان قاضی عبدالودود پر چھاپہ مارکر جھنڈا اتارا اور خدائی خدمتگاروں کو پیٹا حاجی مظفرالدین (مالک مکتبہ صدیقیہ اکوڑہ) کے گلے میں قرآن پاک تھا۔ انگریز پولیس کپتان بیلی رام نے مظفرالدین کو مارا پیٹا او۔ قرآن پاک اس کے

گلے سے اتار کر دور پھینکا۔ اس چھاپے میں عبدالحمید کشمیری، غلام محی الدین حجام، حاجی محمد آثم (محلہ دھوبیان) اور سعداللہ خان (محلہ شیخان) بری طرح زخمی ہوئے۔

اکوڑہ خٹک کے سزایافتہ خدائی خدمتگار:-

تحریک آزادی کے اس کٹھن مرحلے پر ۱۹۱۳ء میں اکوڑہ خٹک کے جن خدائی خدمتگاروں کو انگریز سامراج نے قیدوبند کی سزادی ان میں قاضی ظہیرالدین صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، جرنیل سیف الحق صدیقی صاحب، ماسٹر نوالبصر صاحب، قاضی شمس الحق صاحب، میجر شیرین خان صاحب، سید نور بادشاہ صاحب، چاچا غلام ربانی صاحب، غلام جان کاشمیری صاحب، قاضی شریف اللہ صاحب شامل تھے۔ صوفی میاں گل صاحب، محمد گل صاحب اور عبدالرفیق صاحب کو سو روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔

اکوڑہ خٹک میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی آمد:

۲۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو اکوڑہ خٹک سوشلسٹ کانفرنس میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اور پنجاب کے مشہور سماجی کارکن منشی احمددین نے تقریریں کیں۔ کانفرنس میں دو ہزار کے لگ بھگ افراد تھے۔ اس موقع پر "دجنگ بگل" کے نام سے پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ اس پمفلٹ کے مضامین کی تیاری وترتیب میں محمد انور خٹک اور حاجی محمد آثم پیش پیش تھے۔

اکوڑہ خٹک میں مسلم لیگ کا قیام:-

اکوڑہ خٹک میں مسلم لیگ کے قیام اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں خان اعلیٰ محمد زمان خٹک مرحوم پیش پیش تھے۔ اکوڑہ خٹک میں مسلم لیگ کا پہلا جلسہ ۴ اگست ۱۹۴۵ء کو منعقد ہوا۔ جس میں باشندگان اکوڑہ خٹک کو مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ خان اعلیٰ محمد زمان خان خٹک نے اس جلسے کی صدارت کی تھی۔ جناب بابو نورالہی قریشی، جناب ملک فرید خان، جناب حاجی محمد لکے زئی، جناب دلبراخون جناب مولانا امیرزادہ صاحب مسلم لیگ کے سرگرم کارکنوں میں شامل تھے۔ بقول برادرم طاہر احمد سعید صدیقی اکوڑہ خٹک میں مسلم لیگ کا قیام ۱۹۳۶ء میں عمل میں لایا گیا۔

تحریک آزادی اور اکوڑہ خٹک کے دینی مدارس:-

رئیس المجاہدین حضرت مولانا سید احمد شہید بریلویؒ نے جب اکوڑہ خٹک کی سرزمین پر قدم رکھا، تو فرمایا: "یہاں کی مٹی سے مجھے علم کی خوشبو آرہی ہے"۔ آپ کا یہ ارشاد بجا تھا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں جہاں اکوڑہ خٹک کے غیور فرزندوں نے وقتاً فوقتاً نعرہ حریت بلند کیا۔ وہاں یہاں کے بیشتر علماء علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف تھے اور برطانوی سامراج کے خلاف علوم دینیہ سے منور مجاہدین اور باعمل علماء کی ایک بہت بڑی تعداد تیار کررہے تھے۔ اکوڑہ خٹک کی

مشہور مساجد میں جو دینی مدارس قائم تھے ان میں اکوڑہ خٹک کے مشہور روحانی پیشوا حضرت قطب الارشاد سید مہربان شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۶۷ھ) کا قائم کردہ مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم جو قیام پاکستان کے بعد جامعہ اسلامیہ کے نام سے مشہور ہوا سرفہرست ہے۔ تحریک آزادی کے نامور سپوت جناب حاجی صاحب ترنگزئیؒ کے رفیق خاص حاجی محمد امین صاحبؒ اسی مدرسے کے فارغ تھے۔ اکوڑہ خٹک کے شیخ صدیقی خاندان کے مشہور عالم دین حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ (۱۸۸۴ء - ۱۹۲۴ء) نے دریائے لنڈا کے کنارے سفید مسجد میں مدرسہ اعظمیہ قائم کیا تھا۔ جس کے اساتذہ میں اکوڑہ خٹک کے ممتاز عالم دین مولانا سید عبدالنور صاحب المعروف بہ صحرئی ملا صاحبؒ شامل تھے۔ موصوف حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ اور یوں اشاعت علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ اس شمع حریت کو بھی روشن رکھا جو آپ تحریک آزادی کے سلسلے میں اکابرین دیوبند کی صحبت سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس دوران حضرت سید عبدالرحیم صاحبؒ المعروف بہ قصابانو حاجی صاحب (۱۸۴۸ء - ۱۹۵۶ء) محلہ قصابان کی قدیم مسجد میں طویل عرصے تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔ اور جید علماء دین کی ایک بڑی کھیپ تیار کی۔ اکوڑہ خٹک کے مشہور عالم دین حضرت مولانا عبدالقیوم استاد صاحبؒ نے محلہ کفش گر میں علوم دینیہ کی تدریس جاری رکھی۔ خدائی خدمتگار تحریک کے معروف کارکن اور مشہور شاعر نے جناب عبدالخالق خلیق اور جناب اجمل خٹک آپ ہی کے شاگردوں میں سے ہیں۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مرشدی حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ نے ۱۹۳۳ء میں اپنی مسجد میں درس نظامی میں شامل دینی کتب کی تدریس شروع کی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ نے بچوں کیلئے دینی تعلیم کی غرض سے مدرسہ تعلیم القرآن کی بنیاد رکھی۔ جہاں پرائمری سکول میں رائج کتب کے علاوہ بچوں کو ناظرہ پڑھایا جاتا تھا۔ نماز جنازہ، نماز عید سکھائی جاتی تھی۔ اور بعض قرآنی سورتیں بچوں کو حفظ کرائی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس مدرسے کے پہلے مدرس تحریک آزادی کے نامور کارکن اور مشہور پشتو شاعر قاضی عبدالودود اسیر صاحبؒ تھے، جنہوں نے آزادی کے حصول کی خاطر فرنگی قید کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ تحریک آزادی کے جید عالم دین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید احمد مدنی صاحبؒ ۹ مئی ۱۹۳۸ء کو دیوبند سے اکوڑہ تشریف لائے اور مدرسہ تعلیم القرآن کا معائنہ فرمایا۔ اس موقع پر خان اعلیٰ محمد زمان خان خٹک صاحب بھی موجود تھے۔ آپ نے فی البدیہہ نظم میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ مولانا حسین احمد ہیں یارو جنہیں تم دیکھتے ہو چشم سر سے

رکھو پاس ادب خاموش ہوکر بھرو دامان دل علمی گہر سے
کہاں یہ بطل حریت کہاں ہم جولاتے گھر نہ عبدالحق ہنر سے
ہیں مولانائے عبدالحق جو ہم میں رہیں گے اے خٹک فتح ونصر سے
یہ مکتب درس اسلامی کا یارب رہے محفوظ ترسوئے نظر سے

(یادگار خٹک ص ۱۴)

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا قیام ہمارے لیے آزادی کے تحائف میں سے ایک بیش بہا اور بے مثل تحفہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس مثالی دینی ادارے کے قیام کا پس منظر مرشدی حضرت شیخ مولانا عبدالحقؒ صاحب (۱۹۰۶ء تا ۱۹۸۸ء) بیان فرماتے تھے "جس وقت تقسیم ہوئی، پاکستان بنا تو اس وقت ہم نے بھی یہ سوچا کہ اس ملک میں اسلام کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ پھر دل میں آیا کہ اسلام کے لیے اکیلے کیا کرسکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ پھر دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور انکے چند ساتھیوں نے اسلام کا جھنڈا لیکر بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے فتح کیا تو ہم کیوں یہ نہیں کرسکتے۔ کہ ہم اسلام کا جھنڈا لیکر اسلامی تعلیمات کا اور خصوصاً یہ پاکستان جس نظریے کی بنا پر بنا ہے ہم اس نظریے کو پھیلانے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ تو ہماری لہذا بھی اللہ تعالیٰ ضرور کریں گے۔ تو ہم نے سوچا کہ ہمارے پاس نہ دولت ہے اور نہ شریعت کے عملی نفاذ کا موقع۔ نہ ہم یہ کرسکتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی نظام نافذ کردیں اس لیے کہ اختیارات نہیں۔ لیکن کوشش تو کرسکتے ہیں۔ تو اگر ہم کوشش کرینگے ۱۸۵۷ء میں اسلام باقی رہا۔ اور پھر اس کی بعد تقسیم ہند کے وقت وہ علوم باقی رہے اور اب پورے برصغیر میں اسکی بڑی بڑی جامعات قائم ہوچکی ہیں۔ تو اب جب تقسیم ہوگئی لہذا اب اسلام، اسلامی علوم کو باقی رکھنے کیلئے مدرسہ کی بنیاد رکھی"۔ آزادی کے بعد اس ادارہ نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کی تفصیل بڑی طویل ہے کیونکہ

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

اکوڑہ خٹک کے شعراء اور تحریک آزادی:۔

تحریک آزادی کے سلسلہ میں اکوڑہ خٹک کے شعراء نے فرنگی استعمار کے خلاف جو قلمی جہاد کیا اور پشتون قوم میں جذبہ حریت پیدا کرنے کیلئے دور غلامی میں وقتاً فوقتاً جو نظمیں تخلیق کیں وہ ہماری ادبی اور آزادی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ ان شعراء حضرات میں چند مشہور

شعراء کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔

خان اعلیٰ محمد زمان خان خٹک (۱۲۸۴ھ ۔ ۱۳۷۹ھ) :- آپ اکوڑہ خٹک میں مسلم لیگ کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ فرنگیوں نے آپکو خان بہادر کا خطاب دیا تھا لیکن تحریک پاکستان کے سلسلے میں آپ نے خطاب واپس کردیا ۔ قوم نے آپ کو خان اعلیٰ کا خطاب دیا ۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں قائداعظم دن رات محنت کررہے تھے تو آپ نے ان الفاظ میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا ۔

یارب زبادتند حوادث نگاہ دار　　اے پیر کارواں مدد غیب یاد تاں
محکم ززور بازوئے ملت شود بزور　　اے خضر ! یاری تو رساندبہ منزلش
قومی سفینہ راکہ بہ قلزم فتادہ است　　جیش عدوئے دین بہ کیں ایستادہ است
قومی اساس کارکہ قائد نہادہ است　　مشرک بدوش برق وموحد پیادہ است

جناب محمد اکرم خادم قریشی : (۱۸۸۸ء ۔ ۱۳۷۳ھ) :- آپ کے والد اکوڑہ خٹک سے چارسدہ منتقل ہوئے ۔ اور خادم صاحب نے خدائی خدمتگار تحریک میں ازادی کے سلسلے میں جو نظمیں لکھیں تھیں وہ اپنے دور میں بے حد مقبول تھیں ۔" نظم آزادی " کے دو شعروں کا اردو ترجمہ بطور نمونہ پیش خدمت ہے ۔

که دخیال د آزادی دخپل وطن وی　　اگر تمھیں اپنے وطن کی آزادی کا خیال ہو
که دا اور دی لگیدلے په بدن وی　　اگر تمھارے بدن میں آتش حریت لگی ہو
نور غمونه ددنیا کړه واړه شاته　　تو باقی تمام غم پس پشت ڈال
که دې مینه دې لیلیٰ ته ددیدن وی　　اگر تمھیں لیلیٰ آزادی کے دیدار کی آرزو ہو(رسالہ پشتو

جناب قاضی عبدالودود اسیر (۱۹۰۸ء ۔ ۱۹۹۴ء) :- فرنگی استعمار کے خلاف آپ نے جو انقلابی نظمیں لکھیں تھیں اور تحریک آزادی کی سلسلے میں سرخپوش تحریک کے سٹیج پر مختلف اجتماعات میں پیش کیں وہ بے حد مقبول ہوئیں ۔ انگریز استعمار نے کئی بار آپ کو پس زندان ڈالا ۔ نمونہ اشعار :-

اے پښتونه پاڅه غور ده ځان وکړه　　ده وطن ده ازادئ څۀ سامان وکړه
لکه مصر چه ازاد جمال الدین کړو　　ته د هند د ازادئ اعلان لو کړه

(ترجمہ) اے افغان اٹھ وطن کی آزادی کی فکر کر ، اپنی جان کی فکر کر ، جیسے جمال الدین نے مصر کو آزاد کیا ۔ تو ہند کی آزادی کا اعلان کر ۔ (رسالہ پشتون اپریل ۱۹۳۹ء)

جناب عبیرالبشر زخمی :-(۱۹۴۰ء ۔ ۱۹۷۷ء) :- خدائی خدمتگار تحریک کے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے آپ نے متعدد انقلابی نظمیں تخلیق کیں ۔ آپکی ایک نظم کے دواشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں

خدایه څۀ شو د پښتون هغه غیرت چې به ئې سر وو تل دفخر نه لوچت

نن هغه ځان ته کندر غواړي په سوال چې پرون د چا په هند وو حکومت

ترجمہ :- خدایا کہاں گئی وہ پشتون کی غیرت، جن کا سر ہمیشہ فخر سے اونچا ہوتا تھا، وہ آج کھنڈر کی بھیک مانگ رہا ہے جو کل ہند پر حکمران تھا۔ (رسالہ پشتون جنوری ۱۹۴۷ء)

جناب عبدالکبیر اکوڑوی :- آزادی کے سلسلے میں مرحوم کی معیاری انقلابی نظمیں جذبہ حریت سے سرشار پروانوں میں بے حد مقبول تھیں۔ ایک نظم کے دو اشعار پیش خدمت ہیں:

اغیار به خپله بستره زموږ له ملکه وتړی د اتفاق نعره که وکړی مخلصان د وطن

پښتونه راشه دا رسۍ د اتفاق ونیسه به دښمنانو به دی خرڅ کړی دښمنان د وطن

ترجمہ :- اغیار خود اپنا بستر باندھ کر چلے جائینگے۔ اگر اتفاق کا نعرہ مخلصان وطن بلند کریں۔ پشتون! آ اتفاق کی رسی پکڑ، دشمن تجھے اغیار کے ہاتھ فروخت کرلیں گے۔ (رسالہ پشتون جنوری ۱۹۳۹ء

جناب اجمل خان خٹک (۱۹۲۵ء پ۔):-

انگریزی استعمار کے خلاف آپ کی پہلی نظم رسالہ پشتون میں ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ جب آپ گورنمنٹ مڈل سکول اکوڑہ خٹک کے ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ملاحظہ ہوں آپ کی اس نظم کے چند اشعار:-

څوک چې عاشق وی به خندا رسۍ د دار ښکلوی

دګل د یاره بلبلان څوکې د خار ښکلوی

چې په سینه باندې ګولۍ د ملک د یاره زغمی

هر یو بشر ئې به عزت مدام یادګار ښکلوی

د وطن ناوی به هغه ننګیالے ځوان راولی

څوک چې به خپلو وینو رنګ د خیل دیوار ښکلوی

ترجمہ۔ وہی عاشق صادق کہلاتا ہے جو ہنس ہنس کر دارو رسن کو چومتا ہے۔ گل کی خاطر نوک خار کو بھی بوسہ دیتی ہے۔ جو سپوت وطن عزیز کی خاطر اپنے سینے پر زخم کھا کر جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے تو لوگ اسی کے سنگ مزار کو بوسہ دینا سعادت سمجھتے ہیں۔ عروس وطن کو وہی باحمیت نوجوان لا سکتا ہے جو اپنے لہو سے جیل کی دیواروں کو سجاتا ہے۔

(۱) پاکستان کی بقاء واستحکام

نظریۂ پاکستان یعنی اسلامی قانون اور اسلامی طرز حیات سے وابستہ ہے

(۲) خونی انقلاب سے نجات اور پائیدار اقتصادی، معاشی نظام کا علاج بلا امتیاز ملک گیر احتسابی عمل سے منسلک ہے

منجانب میاں حضران بادشاہ

منیجنگ ڈائرکٹر فیصل کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ (شرکت الفیصل المحدود)

پی ٹی سی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

حافظ محمد ابراہیم فانی
مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

پاکستان کی بنیادی خارجہ پالیسی میں اولین وزیر خارجہ سر ظفراللہ خان کا شرمناک کردار

یہ بات مسلمہ ہے کہ کسی ملک کی نیک نامی اور بدنامی میں اس ملک کی خارجہ پالیسی کو اولین حیثیت حاصل ہے اور جتنی اس کی خارجہ حکمت عملی کامیاب ہوگی اتنی ہی اس ملک کی اقتصادی و معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی دفاعی پوزیشن بھی مضبوط ہوگی۔ گویا خارجہ پالیسی کو امور مملکت میں تقریبا تمام شعبوں پر گوئے سبقت حاصل ہے۔ آج ہم جب اپنے گرد وپیش اور خریطہ عالم پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ ممالک جن کی خارجہ پالیسی اور فارن ڈپلومیسی کامیاب ہے وہ قومیں اور مملکتیں رو بہ ترقی ہیں۔ لیکن یہ ترقی اور عروج تب ممکن ہے جب اس ملک کے پالیسی ساز انتہائی زیرک قابل اور عالمی سیاست سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ ان میں انتہائی عقیدت، خلوص اور جذبہ حب الوطنی کی روح موجود ہو۔ اسی ولولے سے سرشار قومیں ہی قوم کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچا سکتی ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں دوسرے شعبوں کی طرح یہ شعبہ بھی کوئی خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہ کرسکا۔ اور نہ ہی پچاس سال گزرنے کے باوجود اس کی کارکردگی قابل رشک تو بہت دور کی بات ہے حوصلہ افزا رہی۔ جوکہ ہماری بدقسمت قوم اور حرماں نصیب ملک کیلئے ایک بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ بالکل واضح ہے جو لوگ تحریک پاکستان اور تقسیم برصغیر کے عمل سے واقف ہیں، ان کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ ارض پاک کے منصۂ شہود پر نمودار ہوتے ہی ایک ایسا شخص اس اہم ترین وزارت پر براجمان ہوا، جو عالمی استعمار کا ایجنٹ، سامراجی قوتوں کا زرخرید غلام اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ صرف دشمن بلکہ مرزائے قادیان کی نبوت کاذبہ کا پرجوش مبلغ اور سرگرم داعی تھا۔ جب اس کے ناپاک ہاتھوں ہماری خارجہ پالیسی کی بنیاد رکھی گئی اور اس کا سنگ افتتاح اس صیہونی گماشتے نے رکھا۔ تو ظاہر ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تاثریا میرود دیوار کج

کے مصداق وہی ہوا ۔ جس کا مشاہدہ ہم گذشتہ کئی برسوں سے کررہے ہیں ۔ ملک تو آزاد ہوا ، لیکن آزاد خارجہ پالیسی کیلئے آج تک ہم منتظر اور چشم براہ ہیں ۔ آنجہانی سر ظفراللہ خان کو " یارلوگ " مافوق الفطرت دماغ والا انسان ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں ، اور اس کو ایک نابغہ (GENIUS) کے طور پر پیش کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہیں ۔ بعض لوگوں کے خیال میں محمد علی جناح بانی پاکستان کو اس بات پر مجبور کیا گیا تھا کہ وہ سر ظفراللہ خان کو پاکستان کی اولین وزارت خارجہ کا قلمدان سپرد کرکے اس عظیم اعزاز کا مستحق ٹھہرائے ۔ چنانچہ انہوں نے بادل ناخواستہ اس کو اس غیر معمولی عہدے کیلئے نامزد کیا ۔ جس کی سزا آج تک ہماری قوم بھگت رہی ہے ۔ حالانکہ اس کا شرمناک کردار تقسیم اور باؤنڈری کمیشن کے وقت الم نشرح ہوچکا تھا ۔

کشمیر کے بارے میں بانی پاکستان محمد علی جناح نے کہا تھا ۔ " کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے " کیونکہ پاکستان میں بہنے والے تمام دریاؤں کا سرچشمہ کشمیر ہے ۔ اور اسے تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے بھی پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے ۔ لیکن جن دنوں حدبندی کمیشن پاکستان اور بھارت کی حد بندی اور علاقوں کی تعین میں مصروف تھا ۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے اپنا اپنا موقف پیش کررہے تھے ۔ اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے سر ظفراللہ خان وکالت کے فرائض انجام دے رہا تھا انہی دنوں جماعت احمدیہ کی طرف سے الگ محضرنامہ کمیشن کو پیش کیا گیا جس میں مرزائیوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مولد قادیان کو ویٹیگن سٹی (VITIGEN CITY) قرار دینے کا مطالبہ کیا ۔ قادیانیوں نے ریڈ کلف کمیشن کو اپنا نقشہ بھی پیش کیا جس میں انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ ظاہر کیا ۔ جماعت احمدیہ نے یہ نقشہ ۱۹۴۰ء میں تیار کیا تھا ۔ حدبندی کمیشن کو الگ میموریندم پیش کرنے کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ سر ظفراللہ خان ایک طرف تو مسلم لیگ کی وکالت کررہا تھا اور دوسری طرف اس کی جماعت نے الگ محضرنامہ کمیشن کے سامنے رکھا تھا ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزائیوں کا یہ مطالبہ تو تسلیم نہیں کیا گیا کہ قادیان کو ویٹیگن سٹی (VITIGEN CITY) قرار دیا جائے ۔ البتہ باؤنڈری کمیشن نے مرزائیوں کے محضرنامہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمدیوں کو مسلمانوں سے خارج کرکے گورداسپور کو مسلم اقلیت کا ضلع قرار دے کر اس کے اہم علاقے بھارت میں شامل کردیئے ۔ اس طرح نہ صرف گورداسپور کا ضلع پاکستان کے حصہ میں نہیں آیا بلکہ بھارت کو کشمیر کیلئے راستہ بھی مل گیا ۔ جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے ۔ چنانچہ سید میر نور احمد سابق ڈائریکٹر تعلقات عامہ اپنی یادداشتوں مارشل لاء سے مارشل لاء تک میں رقم طراز ہیں ۔ " لیکن اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایوارڈ پر ایک مرتبہ دستخط ہونے کے بعد ضلع فیروزپور کے متعلق جن میں سترہ (۱۷) اور انیس (۱۹) اگست کے درمیانی عرصہ میں

ردوبدل کیا گیا۔ اور ریڈکلف سے ترمیم شدہ ایوارڈ حاصل کیا گیا۔ کیا ضلع گورداسپور کی تقسیم اس ایوارڈ میں شامل تھی، جس پر ریڈ کلف نے ۸ اگست کو دستخط کئے تھے۔ یا ایوارڈ کے اس حصہ میں بھی ماؤنٹ بیٹن نے نئی ترمیم کرائی...... ضلع گورداسپور کے بارے میں ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ اس کے متعلق چوہدری ظفراللہ خان جو مسلم لیگ کی وکالت کررہے تھے خود بھی ایک افسوسناک حرکت کرچکے تھے۔ انہوں نے جماعت احمدیہ کا نقطہ نظر عام مسلمانوں سے (جن کی نمائندگی مسلم لیگ کررہی تھی) جداگانہ حیثیت میں پیش کیا۔ چنانچہ معروف مسلم لیگی رہنما میاں امیرالدین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ باؤنڈری کمیشن کے موقع پر ظفراللہ خان کو مسلم لیگ کا وکیل بنانا مسلم لیگ کی بہت بڑی غلطی تھی جن کے ذمہ دار خان لیاقت علی خان اور چوہدری محمد علی تھے .... اس نے پاکستان کی کوئی خدمت نہیں کی، بلکہ پٹھان کوٹ کا علاقہ اس کی سازش کی بنا پر پاکستان کی بجائے ہندوستان میں شامل ہوا"۔ (بحوالہ قادیانیت کا سیاسی تجزیہ) جملہ معترضہ کے طور پر فارسی کا ایک مشہور شعر مجھے یاد آرہا ہے۔ کہ

گربہ میروسگ وزیر وموش رادیواں کنند　　　ایں چنیں ارکان دولت ملک راویراں کنند

پاکستان کے پہلی کابینہ میں بھی کچھ یہی صورتحال تھی۔ سرڈگلس گریسی آزاد اورخودمختار پاکستان کی فوج کا کمانڈر ان چیف سردار جوگندرناتھ مینڈل وزیرقانون اور سرظفراللہ خان وزیرخارجہ۔ کیا ایسے کابینہ سے ملک وقوم کی تعمیروترقی کی توقع کی جاسکتی تھی؟

ہم کو ان سے ہے وفا کی امید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

یہ تو تھی مملکت خداداد پاکستان کے پہلے وزیرخارجہ کی تقسیم ملک کی وقت شرمناک کردار کی ایک ادنیٰ جھلک زرا غور فرمائیے۔ کہ کیا ایسا شخص اس اہم عہدے کے قلمدان کا اہل ہے ہرگز نہیں؟ لیکن کیا کہا جائے، مشہور مصرعہ ہے۔　ع　ہرشاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہوگا؟

کیا اس کیلئے ہزاروں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ ہزاروں عفیفات کی عصمتیں لٹیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔ ہزاروں جوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اور کئی سر پھرے دارورسن پر جھول گئے۔ ہزاروں سہاگ "اجڑ" گئے۔ کتنے بے گناہ تہہ تیغ کردیئے گئے۔ کتنوں کے سر نیزوں کی انیوں پر لہرائے گئے۔ کتنے بچوں کے پیٹ برچھیوں سے چاک کردیئے گئے اور قوم نے یہ تمام مظالم اس لیے خندہ پیشانی سے جھیلے کیونکہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا، ایک آرزو تھی، ایک دلی تمنا تھی، کہ نئی مملکت میں اسلام کا بول بالا ہوگا۔ ہم نہ سہی ہماری نسلیں اور ہمارے بچے اسلام اور شریعت

کی بہاریں دیکھیں گے۔ اگر ان سرفروشوں کو یہ معلوم ہوتا کہ ہماری قربانیوں کا ثمر اس طرح ظہور پذیر ہوگا تو پھر وہ کبھی بھی اتنی بھاری قیمت اداکرنے پر تیار نہ ہوتے۔

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ وبو کرتے

بہرحال یہ تو درمیان میں سخن گسترانہ بات آئی۔ اب چوہدری کے کارہائے نمایاں کی ایک تصویر دوران وزرات خارجہ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دوران وزرات خارجہ آپ نے زیادہ وقت بیرون ملک گزارا اور پارلیمنٹ میں آنے سے کتراتے رہے۔ اس دوران آپ نے پاکستان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر اپنے غیر ملکی آقاؤں کے حکم اور اپنی جماعت احمدیہ کے زاویہ نگاہ سے خارجی پالیسی وضع کی۔ وزارت خارجہ سے محب وطن افراد کو نکال کر مخصوص قادیانی وسیع پیمانے پر بھرتی کئے اور اسی طرح غیر ممالک میں وزارت خارجہ کے دفاتر مرزائیت کی تبلیغ اور جاسوسی کے اڈوں میں تبدیل ہوگئے۔ اسلامی ممالک سے روابط اور تعلقات بڑھانے کی بجائے یورپی ممالک بالخصوص امریکہ اور برطانیہ سے تعلقات بڑھائے گئے۔ عرب ممالک کے ساتھ رشتہ اخوت کو مستحکم کرنے کی بجائے انہیں پاکستان سے بدظن کرنے اور پاکستان سے دور کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی اور عربوں کی جاسوسی کرنے کیلئے مختلف ممالک میں قادیانی سیل قائم کئے گئے۔ برادر ملک افغانستان اور مصر سے جان بوجھ کر تعلقات کشیدہ کئے گئے۔ جس کا خمیازہ آج تک بھگتا جارہا ہے۔ پاکستان کے جغرافیائی محل وقوع اور وطن عزیز کے دفاعی نقطہ نظر سے ہمسایہ ملک چین کی بجائے امریکہ جیسے خودغرض ملک کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائی گئیں۔ مسئلہ کشمیر کو دیدہ دانستہ حل کرنے کی بجائے اور خراب کیا گیا۔ اسی لیے آج تک اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی جماعت سے وفاداری کا یہ عالم کہ وزیرخارجہ کی حیثیت سے تنخواہ قومی خزانے سے وصول کرتے رہے لیکن اندرون وبیرون ملک کام جماعت احمدیہ کیلئے کرتے رہے۔ بحوالہ "قادیانیت کا سیاسی تجزیہ" سرظفراللہ خان کے اس گھناونے کردار پر ایڈیٹر" نوائے وقت" جناب حمید نظامی نے اپنے غیر ملکی دورے سے واپسی پر اپنے اخبار کے ایک اداریے میں لکھا کہ بیرون ملک پاکستان کے سفارت خانے تبلیغ مرزائیت کے اڈے اور ان کے جماعتی دفاتر معلوم ہوتے ہیں۔ سر ظفراللہ خان کے دورمیں ناقص پالیسی کے باعث ہمیں سیاسی اقتصادی اور ثقافتی طور پر ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ چونکہ احمدیہ جماعت برطانیہ کی خودکاشتہ اور امریکہ کی لے پالک تھی۔ اس لیے اس نے پاکستان کو یورپی ممالک کا دست نگر اور امریکہ کا اقتصادی بھکاری بنادیا۔ اقوام متحدہ میں سب سے زیادہ تعداد اسلامی برادری کی تھی جبکہ پاکستان اسلامی

ممالک کی سب سے بڑی مملکت تھا۔ اسلامی ریاستوں کے سرخیل ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو اسلامی بلاک کی تشکیل و تنظیم کے سلسلہ میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہئیے تھا۔ لیکن سر ظفراللہ خان نے پاکستان کے وزیرخارجہ ہونے کی حیثیت سے اسلامی ملکوں کے ساتھ گہرے مراسم مسلسل روابط اور روایتی گرم جوشی کے برعکس سرد مہری کا رویہ اختیار کئے رکھا۔ انہی اسلامی ممالک سے تعلقات سے استوار کئے گئے جو امریکہ و برطانیہ کے حاشیہ بردار تھے۔ احمدیہ جماعت کے نصب العین کے مطابق اسلام دشمنی اور اسرائیل دوستی ظفراللہ خان کے جسم میں خون کے ساتھ گردش کرتی تھی۔ گو عربوں کی جاسوسی کے مشن کا آغاز مرزا بشیر الدین کے دور میں شروع ہوگیا تھا۔ لیکن چوہدری ظفراللہ خان کے دور میں خارجہ وزارت کی آڑ میں قادیانی جماعت کو عربوں کی مخبری اور جاسوسی کا سنہری موقع میسر آیا۔ اور مختلف عرب ممالک کے سفارت خانوں میں قادیانی مہروں کو فٹ کردیا گیا۔ عربوں کو جب قادیانیوں کے مشکوک کردار اور پراسرار سرگرمیوں کا پتہ چلا، تو ان کے نوٹس لینے سے نہ صرف ہمارا قومی وقار مجروح ہوا بلکہ پاکستان کو عربوں میں ہدف تنقید بنایا گیا۔ (کادیانیت کا سیاسی تجزیہ ص ۴۷۷) صاحبزادہ طارق محمود مرتب "کادیانیت کا سیاسی تجزیہ" میں ہفت روزہ لولاک، اپریل ۱۹۷۳ء کے حوالے سے رقمطراز ہیں: جب عرب نمائندے مسئلہ فلسطین کو یو این او میں پیش کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے یو این او میں اپنی قرارداد کے حق میں فضا سازگار کرنے کیلئے دوست ملکوں کے نمائندوں سے ملاقاتیں کیں اور اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں وہ چوہدری ظفراللہ خان سے بھی ملے اور ان سے تعاون کی التجا کی۔ ظفراللہ خان نے انہیں کہا! کہ اگر ان کے امام جماعت اور مرزا بشیرالدین محمود خلیفہ ربوہ۔ اس بات کی ہدایت کریں گے تو انکی مدد ضرور کرینگے۔ اس لیے آپ لوگ مجھے کہنے کی بجائے ربوہ میں ہمارے خلیفہ صاحب سے رابطہ قائم کریں۔ بے چارے عرب نمائندوں نے کسی نہ کسی طرح مرزا محمود صاحب سے رابطہ کیا اور ان سے تعاون کی درخواست کی۔ مرزا صاحب نے عرب نمائندوں کو یہاں سے تار دیا کہ ہم نے چوہدری ظفراللہ خان کو ہدایت کردی ہے کہ وہ یو این او میں تمھاری امداد کریں۔ (صفحہ ۴۷۹) عرب ڈیلی گیشن نے امریکہ سے جماعت احمدیہ کے نام جو تار ارسال کیا وہ قادیانیوں کی آرگن رسالہ میں شائع ہوا۔ "لیک سیکس ۲ نومبر عرب ڈیلی گیشن نے امریکہ سے بذریعہ تار حضرت امام جماعت احمدیہ کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کی ڈیلی گیشن چوہدری سر ظفراللہ خان کو مسئلہ فلسطین کی تصفیہ تک یہیں ٹھہرنے کی اجازت دی"۔ (الفضل ۸ نومبر ۱۹۴۷ء)

سر ظفراللہ خان کے اس بھیانک کردار پر مرزا غلام نبی جانباز لکھتے ہیں۔

" یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چوہدری سر ظفراللہ خان حکومت پاکستان کی طرف سے لیک سیکس گئے تھے ، تو پھر عرب ڈیلی گیشن کا تار حکومت پاکستان کے نام آنا چاہیئے تھا نہ کہ مرزا بشیرالدین محمود کے نام اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ چوہدری سر ظفراللہ خان نے عرب ڈیلی گیشن کو یقین دلایا تھا کہ میں تو اپنے لیڈر مرزا بشیرالدین محمود کے حکم سے یہاں آیا ہوں ۔ نیز اسکے حکم سے یہاں مزید ٹھہر سکتا ہوں ورنہ عرب ڈیلی گیشن کو پاکستان گورنمنٹ سے اجازت لینی چاہیئے تھی نہ کہ قادیانی خلیفہ سے (بحوالہ کادیانیت کا سیاسی تجزیہ) محولہ بالا کتاب کے صفحہ ۴۸۲ پر ظفراللہ خان کے دو مزید کارنامے ملاحظہ ہوں ۔

" جناب محمد نواز ایم . اے بیرون ملک قادیان سازش بےنقاب کرتے ہوئے رقم طراز ہیں ۔ ظفراللہ خان نے وزارت خارجہ کے کام کو کس طرح چلایا ، اس کا اندازہ ذیل کے دو خبروں سے کیجئے ۔ پہلی خبر یہ ہے کہ پاکستان کے محکمہ خارجہ کی طرف سے پبلک سروس کمیشن کے صدر مسٹر شاہد سہروردی آج کل انگلستان میں ان امیدواروں سے انٹرویو لے رہے ہیں ، جو ہمارے سفارتخانوں میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ خبر پاکستان پہنچی ، تو یہاں کے اخبارات اور عوام نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا ۔ لیکن حکومت پاکستان نے اسکی کوئی پرواہ نہ کی ۔ اسی دوران انکشاف ہوا ، کہ ہمارے محکمہ خارجہ کے جائنٹ سیکرٹری غیر سے یہودی ہیں ۔ اور محکمہ خارجہ کے ۸۰ فیصد ملازمین غیرملکی خصوصاً انگریز ہیں ۔ ایک انگریزی معاصر کی اطلاع کے مطابق یہودی جائنٹ سیکرٹری گریفتھ کوئین تقسیم سے پہلے پنجاب ہائی کورٹ کا ایک رجسٹرار تھا ، چونکہ یہ اپنے عہدے کے لحاظ سے ناموزوں انسان تھا ۔ اسلیے اسکو اس سے علیحدہ کردیا گیا ۔ تقسیم ملک کے بعد اس کی قسمت چمکی ۔ اور وہ وزارت خارجہ کا جائنٹ سیکرٹری بن گیا ۔ چونکہ ماتحت افسران نوجوان اور ناتجربہ کار تھے ۔ اسلیے وزارت خارجہ کا سب سے زیادہ قابل اعتماد افسر خیال کیا جانے لگا ۔ جب فلسطین میں یہودی عربوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے ، تو اس وقت پاکستان کی وزارت خارجہ کے قابل اعتماد افسر صاحب اسرائیل میں چھٹیاں منارہے تھے ۔ (گارجین . بحوالہ کوثر لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء اس خبر کے ساتھ یہ انکشاف بھی ملاحظہ ہو ۔ " ہمارے مصری سفارتی کے سٹاف میں دو (۲) نوجوان یہودی لڑکیوں کو ملازم رکھا گیا جس پر مصری عوام او عربی اخبارات پاکستان سے بہت ناراض ہوئے ۔ ان سے پہلے مصر میں پاکستانی سفیر کا پریس اتاشی بھی یہودی تھا ۔" گارجین . بحوالہ کوثر لاہور ، ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء ۔ اسی طرح کے شرمناک واقعات کی ایک لمبی فہرست ہے جسکا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں ہوسکتا ۔ البتہ جب ہمارے حکمرانوں نے خواب غفلت سے انگڑائی لی اور کچھ ہوش سنبھا تو اس وقت پل کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا تھا اور آج تک ہم ان زہریلے اثرات سے جانبر نہ ہوسکے ۔ بیرون ملک ہمارے سفارت خانے اور سفراء ملک کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہ کرسکے ۔ اسکا اندازہ

وقتاً فوقتاً اخباری رپورٹوں اور بیرون ملک پاکستانیوں کے بیانات اور واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ جبتک ان سفارتخانوں کی مکمل تطہیر نہیں ہوتی اور ان کی جگہ قابل، نظریہ پاکستان سے مخلص اور دوسرے اہل افراد کا تقرر نہیں ہوگا۔ قعرمذلت میں ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ ماضی قریب میں پاکستان کئی دفعہ اہم موقعوں پر خارجی میدان میں رسوائی سے دوچار ہوا اور ہمارے روایتی بااعتماد دوستوں نے بھی ہمیں تنہا چھوڑدیا تھا۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ سرظفراللہ خان کو حکومت پاکستان کی طرف سے وزارت خارجہ کی آڑ میں مرزائیت کی تبلیغ وترویج کا ایک زرین موقعہ ہاتھ آیا تھا، چنانچہ اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ کادیانیت کا سیاسی تجزیہ کے فاضل مرتب نے ایشیا لاہور ۱۷ دسمبر ۱۹۶۲ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ " اس طرح سر ظفراللہ خان نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقبل مندوب کی حیثیت سے جزائرغرب الہند کا دورہ کیا، اور اس دورہ میں ٹرینداد میں مرزا صاحب کا آخرالزمان نبیؐ کی حیثیت سے تعارف کرایا" فاضل مرتب آگے لکھتے ہیں کہ سرظفراللہ کی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ تقریباً ۴۰ ممالک میں قادیانیوں کے ۱۴۲ مشن کام کررہے ہیں، ان میں سے ایک اسرائیل میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان مختلف ممالک سے انکے ۲۲ اخبارات ورسائل بھی نکلتے ہیں۔ اور ۷۵ کے قریب مدارس کام کررہے ہیں۔ (۱) ص ۴۸۴۔ اسی طرح المنبر ہی کے حوالے سے سرظفراللہ کا ایک اور کارنامہ ملاحظہ ہو۔ " حکومت ملائیشیا نے پاکستان کے چوہدری سرمحمد ظفراللہ خان کی کتاب ISLAMS MEANING FOR MODREN MAN یعنی " اسلام کا مفہوم دورجدید کے آدمی کیلئے " کی اپنے ملک میں خرید وفروخت اور درآمد کو ممنوع قرار دیا ہے حکومت کے نزدیک سرظفراللہ خان کی یہ کتاب ملائیشیا کے سرکاری مذہب اسلام کے عقائد ونظریے کے منافی ہے" (صفحہ نمبر ۵۰) آخر میں ہم ارباب بست دکشاد سے پاکستان کے پچاس سال مکمل ہونے پر بجائے اسکے کہ " گولڈن جوبلی" کی بیہودہ اور بے فائدہ تقریبات منائی جائیں۔ اپنی فاش اور عظیم غلطیوں کا ازالہ کرنے کیلئے محاسبہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ہم ایک عظیم مسلمان قوم اور اسلامی مملکت کی حیثیت سے اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے قابل ہوجائیں ورنہ پھر بجائے ترقی وعروج کے تنزل و انحطاط کیطرف ہماری رجعت قہقری اسی طرح جاری رہے گی۔ جس کا نتیجہ ہماری مکمل تباہی کی صورت میں دنیا کے سامنے آجائیگا۔ ولافعلهاالله۔ یہی وقت ہے ہمارے سنبھلنے کا اور " احساس زیاں " کے ادارک کا ورنہ بقول حکیم الامت:

آخرشب دید کی قابل تھی بسمل کی تڑپ　　صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا توکیا؟

---

(۱) فاضل مرتب نے یہ اقتباس المنبر لاہور ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء سے دیا ہے۔ اب جبکہ ۱۹۹۷ء ہے اور اس کے پورے ۳۰ سال مکمل ہوگئے ہیں۔ انہوں نے کتنی ترقی کی ہوگی۔ جبکہ اس کی ایک واضح مثال احمدیہ ٹی وی ہے۔ جس میں یہ لوگ شب وروز مسلمانوں کو مرتد کرنے کی سعی نامسعود میں مصروف ہیں۔ (فانی)

جناب پروفیسر ریاست علی خاطر صاحب

"محاسبہ"

پورے ملک میں پاکستان کی "گولڈن جوبلی" کی تقریبات کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ امسال ہر شاندار تقریب جوبلی سے معنون ہے۔ ۱۴ اگست کو جشن آزادی کے نام پر ملک کی بڑی بڑی عمارتوں پر چراغاں کیا جارہا ہے اور ملک کی بے پناہ دولت کو پانی کی طرح بہا کردینے والوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہم عظیم ہیں، ہم آزاد ہیں، ہم خوشحال ہیں۔

پاکستان کی "گولڈن جوبلی" کے موقع پر تاریخ و تحریک پاکستان کے حوالے سے بے شمار مضامین چھپ رہے ہیں۔ جگہ جگہ تقریریں ہورہی ہیں، گیت مرتب ہورہے ہیں، ترانے لکھے جارہے ہیں اور خوشی کی نئی دھنیں ترتیب دی جارہی ہیں۔ میڈیا کی طاقت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی جارہی ہے کہ ہم کرہ ارض کی وہ خوش قسمت قوم ہیں، جس نے آزادی کا پورا ثمر پالیا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ ایسے ہی ہے جیسے ہمیں دکھائی دے رہا ہے۔ یا پھر کسی بڑے مداری کا کوئی ایسا تماشا ہے۔ جس کی حقیقت کچھ اور ہے او ہمارے سامنے کچھ اور پیش کیا جارہا ہے۔ اس بات کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل اس لیے نہیں ہے کہ ہم اس دھرتی کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ہماری آنکھوں نے ایسے کئی تماشے دیکھے ہیں۔ ہمیں نئے نئے ناموں کے ساتھ فریب دیا گیا اور ہماری چشم تماشا اس فسوں کاری کی عادی ہوچکی ہے۔

آج پاکستان کا ہر باشعور فرد یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا ہم نے آزادی حاصل کرلی ہے؟ کیا ہماری آزادی کے پچاس برس گزر چکے ہیں؟ کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ کیا ہم نے آزادی کا مقصد حاصل کرلیا ہے؟ کیا جس سوچ کے تحت ہندوستان کو تقسیم کرکے پاکستان کی تشکیل کی گئی وہ پروان چڑھی ہے؟ کیا تحریک پاکستان میں مسلمانان ہند کے سامنے جس اسلامی معاشرے کے قیام کا نقشہ پیش کیا گیا وہ نقشہ مکمل ہوچکا ہے؟ کیا ہم نے ایک ایسا اسلامی معاشرہ تشکیل دے دیا ہے جس میں ہر شخص کی جان ومال کے ساتھ عزت و آبرو محفوظ ہے؟ کیا ملک سے سرمایہ دارانہ نظام ختم کرکے اسلام کا عادلانہ نظام نافذ ہوچکا ہے؟ کیا بادشاہت وآمریت کو مٹا کر اسلامی جمہوری نظام رائج ہوچکا ہے؟ کیا ہماری عدلیہ آزاد ہے؟ کیا ملک میں انصاف کا حصول سہل اور مفت ہے؟ کیا سودی نظام کا خاتمہ کردیا گیا ہے؟ کیا معیشت کو سب کیلئے سودمند بنادیا گیا ہے؟ کیا ہر شخص کا معاوضہ اس کی محنت کے مطابق

کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان سے سمجھوتہ کئے ہوئے ہیں۔

حقیقی آزادی کیا ہے؟

غیروں کے افکار ونظریات سے آزادی، غیروں کے نظام حکومت سے آزادی کے ساتھ انکے نظام حیات سے آزادی، انکی وضع قطع اور عادات ورسومات سے آزادی حتیٰ کہ اپنی خواہشات اور وساس نفس وشیطان سے آزادی، یہی حقیقت میں آزادی کا صحیح مفہوم ہے۔

جب تک افراد انفرادی سطح پر اپنی خواہشات نفس اور خود غرضی (Selfishness) کے ان چھوٹے چھوٹے بتوں کو دوسروں کے فائدے اور ملکی مفاد کے لئے پاش پاش نہیں کریں گے اس وقت تک وہ آزادی کے اس مفہوم سے کبھی بھی بہرہ ور نہیں ہوسکتے، جسکی قرآن حکیم دعوت دیتا ہے۔ قرآن عظیم نے صاف صاف الفاظ میں یہ بتا دیا ہے کہ وہ شخص جس نے اپنی ھوا (خواہش نفس) کو اپنا الہ (معبود) بنالیا وہ آزاد نہیں بلکہ غلام ہے۔ بمطابق آیت " افرایت من اتخذالھہ ھواہ " چنانچہ ثابت ہوا کہ اصل آزادی یہ ہے کہ انسان انفرادی سطح پر اپنی خواہشات نفس کی غلامی کا طوق اتار کر رب کائنات کی اطاعت میں آزادی حاصل کرے اور اسلام میں پورے داخل ہونے کیلئے اور پکا سچا مسلمان بننے کیلئے رحمت دوعالم حضرت محمدؐ کی سیرت طیبہ کو اپنا آئیڈیل بنائے کیونکہ

مصطفیٰ برساں خویش راکہ دین ہمہ اوست   اگر باوُ نہ رسیدی بو لہبی است

اور اجتماعی سطح پر اس عہد سے وفاکریں جو ہم نے تحریک آزادی کے وقت کیا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ " لاالہ الا اللہ " یعنی جب پاکستان بن گیا تو اس میں کسی اور کا نظام نہیں چلے گا بلکہ اللہ کا نظام یعنی دین اسلام کا نفاذ ہوگا۔

چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس وقت تمام بنی نوع انسان کو باطل نظاموں اور ازمز کی غلامی سے اسلام کی آزادی کی طرف رہنمائی کی جائے اور حضرت سعدؓ کے ان تاریخی الفاظ کا مصداق بناجائے کہ: " انا قدارسلنا لنخرج الناس من الظلمات الجہالۃ الی نور الاسلام ومن جورالملوک الی عدل الاسلام " یعنی بلاشبہ ہم بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے ایمان کی روشنی کی طرف اور بادشاہوں کے ظلم وستم سے عدل اسلام کی طرف نکالیں۔

✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠

✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠✠

جناب مولانا ذاکر حسن نعمانی صاحب
فاضل جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک

اکیسویں صدی کی آمد اور پاکستان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا فرمایا اور اس میں اپنی قدرتوں اور صفات کا ظہور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ظہور جتنا انسان میں فرمایا ہے اتنا کسی اور مخلوق میں نہیں فرمایا۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر اتم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو قوت عاقلہ، عقل دراک اور قوت تدبر کے ساتھ دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ حیوانات کے رہن سہن کے طریقے آج تک نہیں بدلے۔ سانپ، بچھو، چیونٹی اور کیڑے وغیرہ آج تک بلوں میں رہ رہے ہیں۔ درندے اپنے ابتدائی دور سے لیکر اسی ترقی یافتہ دور میں بھی غاروں اور جنگلوں میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ عام پرندے آج تک ایک ہی قسم کے گھونسلوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ مذکورہ حیوانات میں عقل اور تدبر کی قوت نہیں۔ لیکن انسان کے حالات ابتدائے آفرینش سے تغیرپذیر اور روبہ ترقی ہے۔ ماکولات، مشروبات، مشمومات، ملبوسات اور مساکن میں کتنی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ایک منزلہ عمارت سے لیکر سومنزلہ عمارت بنالی۔ زمین کے پیدل سفر سے ہوائی سفر شروع کردیئے، ایک دور آئے گا کہ زمین کی سیروسیاحت کی جگہ چاند اور مریخ کی سیر وتفریح شروع ہوجائے گی۔ سائنسی آلات نے اتنی ترقی کی کہ ماں کے پیٹ کے اندر موجود بچے کے بارے میں مخفی احوال کے بارے میں بتانا اب مشکل نہیں آلات کے ذریعے سے ماں کے پیٹ میں موجود بچے کے بارے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کو فلاں بیماری لگی ہوئی ہے۔ جاپان میں تو بادوباراں کے بارے میں بالکل صحیح معلومات فراہم کی جاتی ہے، کہ فلاں وقت پر بارش ہوگی، اور فلاں وقت میں رک جائیگی۔ یہ سب عقل وسائنس کے کرشمے ہیں۔ اسلام نے دنیاوی زندگی اور دنیاوی ترقی میں ہماری عقلوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ بشرطیکہ قرآن وحدیث کی مخالفت لازم نہ آتی ہو۔ حضور اکرمؐ نے ایک موقع پر صحابہ کرامؓ کو کھجوروں کی پیوندکاری سے منع فرمایا تو کھجوریں کم پیدا ہوئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا "انتم اعلم باموردنیاکم" یعنی تم دنیاوی امور بہتر جانتے ہو۔ اسی ارشاد سے بالکل واضح ہے کہ شریعت نے دنیاوی ترقی پر پابندی نہیں لگائی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہماری روحانی راہنمائی اور دینداری کیلئے قرآن وحدیث جیسے مقدس علوم دیئے۔ ان کے بغیر آخرت کا سفر جاری رکھنا محال ہے۔ اور دنیاوی سفر کیلئے عقل جیسی نعمت سے نوازا تاکہ دنیاوی زندگی کا سفر جاری رہ سکے۔ اسلامیات کے موضوع پر تمام کتابیں قرآن وحدیث کی تشریح ہیں۔ اسی طرح فزکس، کیمسٹری

بیالوجی، ریاضی، کتب، طب وانجینئرنگ اور سائنس کی کتابیں عقل، تجربہ اور مشاہدہ کی مرہون منت ہیں۔

اکیسویں صدی کی آمد :- اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے ذہین، قابل اور دردمند دل رکھنے والے ان حالات و واقعات کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی زبوں حالی پر اندر اندر سے گھل رہے ہیں۔ ان کی ترقی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اب جبکہ اکیسویں صدی کی آمد ہے۔ ہر طرف شور برپا ہے کہ اس صدی میں لنگڑالولہ بن کر نہیں بلکہ سینہ تان کر داخل ہوں گے۔ یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ بعض کام راتوں رات نہیں ہوتے بلکہ اِن کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی سال دوسال یا ایک صدی کی بات نہیں بلکہ کئی صدیوں میں اس مقام تک پہنچے ہیں۔ ہمارے یہاں تو ایک روایتی جملہ بہت استعمال ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب پوچھا جائے کہ اسلامی نظام کب نافذ ہوگا تو جواب ملتا ہے۔ راتوں رات نظام نہیں بنتا انتظار کرو۔

اکیسویں صدی کی تیاری :- ایک صدی سوسال پر مشتمل ہوتی ہے سوسال میں کئی قسم کے انقلابات رونما ہوتے ہیں، وہ شخص جو ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا اور آج زندہ ہو تو اس نے اپنے پڑپوتے بھی دیکھ لئے ہوں گے۔ اس نے اس انقلابی صدی کے تمام مراحل دیکھ لئے ہوں گے۔ صدی سے پہلے سال، مہینہ، دن، گھنٹہ، منٹ اور سیکنڈ کی فکر ضروری ہے، کیونکہ صدی سالوں سے بنتی ہے۔ سال مہینوں سے، مہینہ دنوں سے، گھنٹہ منٹوں سے اور منٹ سکینڈوں سے بنتا ہے۔ سیکنڈ کا جوڑ اور تعلق سیکنڈ کیساتھ منٹ کا منٹ کیساتھ، گھنٹے کا گھنٹے کیساتھ، دن کا دن کیساتھ، مہینے کا مہینے کیساتھ، سال کا سال کے ساتھ اور صدی کا صدی کیساتھ ہے۔ گر ہم واقعی ایک صدی کی فکر میں ہیں تو ہمیں ایک ایک سیکنڈ اور منٹ کی قدر کرنی ہوگی۔ اگر ہمارے منٹ اور گھنٹے ضائع ہورہے ہیں اور تقریریں صدی کی فکر کے بارے میں ہوں تو بڑا جھوٹ، فراڈ اور خودکودھوکہ دینا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے انسانوں نے منٹوں اور گھنٹوں کی قدر کی ہے۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں

سب سے قیمتی سرمایہ وقت ہے، لیکن ہم اس کو کس بے رحمی کے ساتھ ضائع کر رہے ہیں۔

ہم نہ دین کے رہے اور نہ دنیا کے۔ دین تو ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور دنیا ٹی وی، کھیل، رسالے اور اخبارات کیلئے وقف ہے۔ دنیاوی ترقی کیلئے ہم نے کونسا وقت مختص کر رکھا ہے۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان میں بھی اکثریت نظریہ پیٹ کی خاطر مشغول تعلیم ہے وہ لوگ جو نظریہ خدمت کے جذبے سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ تو آٹے میں نمک کے برابر نہیں۔ پھر بھی قوم ترقی کے خواب دیکھ رہی ہے اور اپنے تئیں خوش ہیں کہ انشاء اللہ اور اکیسویں صدی میں پروقار طریقے سے داخل ہونگے۔ ہر آدمی یہ سمجھ رہا

ہے کہ شاید قوم میرے علاوہ کوئی جنس ہے جو ترقی کرے گی، حالانکہ ہر انسان قوم کا فرد اور جزِ عظم ہے۔ خود کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ خود کو نہ بھولنا ہی خودی ہے۔

علماء پر الزام:۔ بعض لوگ علماء کرام پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ترقی کے مخالف ہیں بلکہ ایک وزیر صاحب کا بیان اخبار میں چھپا تھا کہ مولوی لوگ ہمیں دوسو سال پیچھے لے گئے۔ یاد رکھیں جب حضور اکرمؐ نے دنیاوی ترقی کی مخالفت نہیں کی تو اس کا صحیح اور سچا وارث کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتا مولوی صاحبان نے نہ کبھی قوت کے ذریعے مخالفت کی ہے اور نہ کبھی تقریر و تحریر سے۔ دنیاوی ترقی اور انتظام کا اسلام کیساتھ اگر تضاد نہیں تو کوئی بھی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اکثر جگہوں میں دنیاوی ترقی کا اسلام سے تضاد نہیں۔ کتنی سڑکیں ہوں، کتنے پارک ہوں، کتنے افسر ہوں، کتنی فوج ہو، کتنے دفاتر ہوں، کتنے صوبے ہوں، کتنے ضلع و تحصیل ہوں، کتنے سکول ہوں، کتنی ریلیں ہوں یہ سب انتظامی امور ہیں۔ شریعت نے ان امور میں ہماری عقلوں کو آزاد چھوڑ دیا یہ ہماری ہمت ہے کہ ان امور کو بطریق احسن انجام دیتے ہیں یا ان کا ستیاناس کرتے ہیں۔ ہاں اگر ریل ہو اور اس میں نماز کا بندوبست نہ ہو، دفتر ہوں اور مسجد نہ ہو، نوکری کا وقت مقرر ہو اور نماز کے لیے چھٹی نہ دی جائے، نصاب تعلیم ہو اور اس میں نظام اخلاق نہ ہو، لڑکوں اور لڑکیوں کا نظام تعلیم ہو اور نظام عفت نہ ہو۔ معاشرہ میں ہر فرد کی جگہ ہو اور علماء کو معاشرہ پر بوجھ سمجھا جاتا ہو تو پھر علماء ایسے نظام کی تطہیر کے لیے کوشش بھی کریں گے اور اس غلط نظام کی مخالفت بھی کریں گے۔

اکیسویں صدی کے تقاضے:۔ اگر ہم قوم اور ملک کیساتھ مخلص ہیں اور ملک اور قوم کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں واقعی شامل کرنا چاہتے ہیں تو پھر یاد رکھیں گے کہ آنے والی صدی ہم سے چند باتوں کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ سیاسی اقتصاد کا دور ہے، سائنس اور کمپیوٹر کا راج ہے، ساری دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے۔ چند منٹوں میں دنیا کے گوشے گوشے سے اطلاعات ملنا دشوار نہیں۔ مقابلہ سائنس، کمپیوٹر، طب اور سیاسی اقتصاد کے میدان میں ہے۔ ترقی پذیر ممالک مخالف کو ڈرانے اور دھمکانے کے لیے خطرناک کیمیائی ہتھیار تو بنارہے ہیں لیکن نہ جنگ کرتے ہیں اور نہ اسلحہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک اور قسم کی جنگ لڑ رہے ہیں کہ مخالف قوم اور ممالک کو سیاسی اقتصاد کے میدان میں ہرادیں۔ میڈیا کے ذریعے اپنے دشمن کو اتنا بدنام کریں کہ وہ خود اپنی شکست تسلیم کرلیں۔ مثال کے طور پر امریکہ نے عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کیں۔ روس کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا۔ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے میں سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ اس طرح ان کی پالیسیوں کے خاطر خواہ نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اس لیئے ہمیں چند خامیاں دور کرنی ہوں گی۔

نظام تعلیم:۔ طبقاتی اور امتیازی طرز تعلیم کو ختم کرنا ہوگا۔ غریب ذہین بچے کو بھی تعلیمی مواقع فراہم کرنا ہوں گے۔ طرز تعلیم میں قرآن، حدیث اور نظام اخلاق کو اپنانا ہوگا۔ ہماری درسگاہوں کے فارغ التحصیل اسلام سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض مخالف ہوجاتے ہیں۔ اسی نصاب تعلیم اور طرز تعلیم نے بہت دوریاں

پیدا کردی ہیں ۔ مالدار اور بڑے عہدے دار اپنے بچوں کو ملک کے اعلیٰ سطح کے سکولوں سے لیکر امریکہ اور لندن تک بھیجنے کا بندوبست تو کرتے ہیں لیکن گھر کے قریب مسجد میں اپنے بچے کو ناظرہ قرآن مجید پڑھنے نہیں بھیجتے، شاید اس لئے کہ غریب بچوں کے ساتھ مسجد میں اختلاط نہ ہوجائے اور کہیں خود ساختہ قائم کردہ امتیازی دیواریں گر نہ جائیں ۔ بقول شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ اگر حکومت کسی اعلیٰ نوکری کے لیے قرآن وحدیث کی تعلیم کا کچھ حصہ شرط قرار دے دے تو مساجد امراء اور کبراء کے بچوں سے بھر جائیں ۔

نظام سیاست :- مدتوں سے برائے نام جمہوریت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ۔ اسلام نے کسی شعبے میں ہماری رہنمائی نہیں کی، اسلامی نظام سیاست کو اپنایا جائے پھر کم از کم لیڈر کیلئے قدرے دنیاوی تعلیم اور چند اچھے صفات کا حاصل ہونا لازم قرار دیا جائے ۔ ممبر اور وزیر سے بڑی بڑی مراعات واپس لی جائیں تاکہ ملک وقوم کے اصلی خادم کوچہ سیاست میں رہ جائیں ۔ اسمبلی کا امیدوار اور الیکشن میں لاکھوں روپے صرف کرتا ہے وہ ممبر بننے کے بعد ملک وقوم کی خدمت کی بجائے اپنی تجوریاں بھرتا ہے ۔ کسی ممبر اور وزیر کو ملک میں کسی قسم کے کاروبار کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے ورنہ اپنے عہدے سے غلط فائدہ اٹھائے گا ۔

ذہین لوگوں کا تحفظ :- امریکہ پوری دنیا سے اعلیٰ دماغ والوں کو جمع کر رہا ہے ۔ لیکن ہم ذہین لوگوں کو بھگا رہے ہیں ہر میدان کے لائق اور ذہین انسان کی سرپرستی کی جائے ۔ اُن کی ہر ضرورت پوری کی جائے ۔ ان کو کام کیلئے میدان مہیا کیے جائیں ۔ حسن کارکردگی پر حوصلہ افزائی کیلئے انعامات دیئے جائیں ۔ ایسے لوگوں کو ملک سے باہر نہ جانے دیا جائے ۔ جاپان والے اپنی ٹیکنالوجی باہر جانے نہیں دیتے ۔ ایک آدمی مکمل موٹر سائیکل نہیں بناسکتا ۔ اگر ایک رم بنارہا ہے تو دوسرا ہینڈل بنائے گا ۔ اگر ہم نے ان باتوں پر عمل کیا تو چند سالوں میں انشاء اللہ بڑے اچھے نتائج سامنے آئیں گے ۔

نظام معیشت :- یہ تو بہت بڑا موضوع ہے اس پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ لیکن ہماری ساری معیشت ایک لفظ میں بند ہے اور وہ ہے " قناعت " اگر اس لفظ پر ہر سطح والوں نے عمل کیا تو دنیا کی سب سے مضبوط معیشت ہماری ہوگی ۔

تنبیہ :- کہیں ایسا نہ ہو کہ اکیسویں صدی کی فکر میں آخرت کا غم وفکر بھی بھول جائیں کیونکہ قوم بہ حیثیت مجموعی تو ضرور اکیسویں صدی میں داخل ہوگی لیکن ہر شخص کا داخلہ ضروری نہیں ہوسکتا ہے کہ موت اس کو آلے ۔ اور آخرت کا داخلہ ہر ایک کو یقینی ہے ۔ لہذا یہ دانش مندی نہیں کہ غیر یقینی داخلے کی فکر میں یقینی داخلہ کو بھول جائیں ۔

جناب مولانا انوار الحق مدظلہ کا سفرنامہ افغانستان اور حافظ راشد الحق صاحب کا "ذوق پرواز" اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ۔ شکریہ (ادارہ)

جناب عبدالماجد صاحب
لیکچرار گورنمنٹ کالج مانسہرہ

آزادی کا مفہوم کیا ہے؟

ہر سال ۱۴ اگست پورے ملک میں بڑے تزک واحتشام سے منایا جاتا ہے۔ اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس دن کو منانے کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کہیں بینرز رنگے جارہے ہیں تو کہیں رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آرائش کی جاتی ہے۔ آخر یہ تمام اہتمام کیوں؟ (قطع نظر اسکے کہ ان تقریبات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟) یہ اس لیے کہ آزادی (Freedom) وہ مسحور کن لفظ ہے جس کے لیے نسل انسانی اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کرنے سے نہیں کتراتی۔ برصغیر پاک وہند کے کروڑوں مسلمانوں نے اس دن انگریز جیسی عیاروجابر قوم کے تسلط اور ہندوؤں جیسی متعصب (Prejudice) قوم کی مکاریوں سے نجات حاصل کی اور اپنے لئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ "کیا انگریزی تسلط کے خاتمہ کا نام آزادی ہے؟ یا حقیقی آزادی کا حصول ابھی باقی ہے؟

بات یہ ہے کہ جسمانی لحاظ سے (Physically) ہم آزاد تو ہوئے لیکن وہ بھی ادھورے کیونکہ

ع وضع میں تم ہونصاریٰ تو تمدن میں ہنود

لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کی وجہ سے ہمارے دل ودماغ غیروں کے غلام ہیں۔ غیروں کی ثقافتی یلغار کی وجہ سے ہمارے بچے اور جوان اسلامی کردار و عمل سے دور سے دور تر جارہے ہیں اور ہم ان اشعار کا مصداق بن چکے ہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر — تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض — تم نے اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

اور یہ تمام چیزیں "اک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف" سمجھتے ہوئے بھی ہم ان کو بدلنے

ہے ؟ کیا دولت کے ارتکاز پر پابندی ہے ؟ کیا اس ملک میں غریب اور امیر کی ہمیں کوئی تفریق نظر نہیں آتی ؟ کیا تمام لوگوں کا معیار زندگی بلند اور تقریباً یکساں ہے ؟ کیا لوگ خوش اور خوشحال ہیں ؟ کیا سب لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ؟ کیا تمام نفرتیں ان میں ختم ہوچکی ہیں ؟ کیا ذات پات مٹ چکا ہے ؟ کیا مذہب نے ان کے سینوں میں محبت پیدا کرکے ان میں بھائی چارگی پیدا کردی ہے ؟ کیا پورے ملک میں امن کا دوردورہ ہے ؟ کیا محمود وایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں ؟ کیا مسجدیں امن کا گہوارہ ہیں ؟ کیا وہ نمازیوں سے آباد ہیں ؟ کیا علماء نے آپس میں لڑنا ترک کردیا ہے ؟ کیا تمام مسلمان فرقے ایک تسبیح کے مختلف دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں پروئے جاچکے ہیں ؟ کیا پاکستان کے تمام لوگوں کیلئے ایک ہی قانون ہے ؟ کیا شاہ وگدا انصاف کیلئے ایک ہی عدالت سے رجوع کرتے ہیں ؟ کیا ملک میں رشوت ، بدعنوانی ، بے انصافی ، لاقانونیت اور برائی کے راستوں کو مسدود کردیا گیا ہے ؟ کیا فوج جذبہ جہاد سے سرشار ہوکر انسانی خدمت پر مامور ہے ؟ کیا ہمسایہ ممالک سے تعلقات برادرانہ ہیں ؟ کیا عالمی سوسائٹی میں ہمارا مقام بلند ہے ؟ کیا ہم کسی کے مقروض نہیں ہیں ؟ کیا برسوں میں شرح ناخواندگی صفر ہوچکی ہے ؟ کیا عوام کو ایک صحت مند ماحول میسر ہے ؟ کیا لوگ پرامید چست اور ہوشیار ہیں ؟ کیا ملک میں ضرورت کی تمام صنعتیں قائم کردی گئی ہیں ؟ کیا ہم زراعت کے میدان میں خودکفیل ہوچکے ہیں ؟ کیا ہمیں ملاوٹ سے پاک اشیاء حاصل ہیں ؟ کیا ملک میں کوئی شخص بے روزگار نہیں ؟ کیا ہر شخص محنت ، جفاکش اور مخلص ہے ؟ کیاسب لوگوں کے دلوں میں قوم کا درد اور پیار ہے ؟ کیا لوگ اطمینان بخش زندگی بسر کررہے ہیں ؟

اگر ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ملے تو سوچیئے کہ ہم نے ان پچاس سالوں میں کیا کیا ؟ غور وفکر کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم نے اس نصف صدی میں کچھ بھی نہیں کیا ۔ جو کام ہمارے کرنے کے تھے وہ ہم نے ترک کردیئے اور جن کاموں کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا ان کو فروغ دیا ۔ ہم نے اپنی کوئی ذمہ داری پوری نہیں کی اور اس نصف صدی میں اپنی دونسلوں کو ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا ۔ ہم دین ودنیا گنوا بیٹھے ہیں ۔ اگر ہم اپنا احتساب کریں اور دیکھیں کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ؟ تو ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ہم نے ان پچاس برسوں میں کھویا ہی کھویا ہے ۔ پایا کچھ بھی نہیں ۔ اور اگر کچھ پایا ہے تو وہ اس ذلت ورسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں جو اقوام عالم میں ہمارا مقدر ٹھہری ہے ۔ ہم جھوٹ موٹ کے الفاظ سے خود کو بہلانے کی جتنی بھی کوشش کریں مگر یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ آج دنیا میں ہمارا کوئی وقار نہیں ۔ آج کسی دوسرے معاشرے میں ایک پاکستانی کو پاکستانی کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے ، اس لئے کہ ایک پاکستانی کو چورا چکا ، بداخلاق اور بددیانت شخص تصور کیا جاتا ہے ۔ بطور قوم بھی ہمیں کوئی ایسا اعزاز حاصل نہیں جس

پر ہم فخر سے سربلند کرسکیں۔ بلکہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے قرضوں کی وجہ سے ہماری قوم کو ایک مقروض بھکاری قوم سمجھا جاتا ہے۔

ہمیں اپنے ملک میں جو تھوڑی بہت ترقی نظر آتی ہے یہ وہ ترقی ہے جو گذشتہ پچاس برسوں میں ساری دنیا کی ترقی کی نسبت سے معمولی درجے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت معاشی طور پر اندرونی اور بیرونی قرضوں کی وجہ سے کئی بلین روپے کے مقروض ہیں۔ اس طرح ہر پاکستانی ہزاروں روپے کا مقروض ہے۔ فکر کی بات یہ ہے کہ یہ قرض کون ادا کرے گا اور کیسے ادا ہوگا۔ آخر ہم اس صورت حال تک پہنچے کیسے؟ ہمیں کس نے لوٹا ہے اور کیوں لوٹا ہے؟ ہمیں غیروں نے نہیں لوٹا، اپنوں نے لوٹا ہے۔ یہ اپنوں کے دیئے ہوئے اتنے گہرے گاؤ ہیں کہ کسی صورت مندمل نہیں ہورہے۔

ہم نے رہبروں کو رہزنوں کی صورت میں پایا ہے۔ ہمارے ملک میں اقتدار پر ایک ایسا طبقہ رہا ہے جس نے ہمارا استحصال کیا ہے۔ ہماری قومی دولت کو لوٹ کرضائع کیا ہے۔ قومی سرمایے سے ذاتی سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔ ملکی سرمایے کو اپنے بنائے ہوئے سیاہ قانون کے ذریعے بیرونی ممالک کے بینکوں میں ذاتی سرمایے کے طور پر منتقل کیا ہے۔ ملکی دولت کو اپنے اقتدار کی خاطر اپنے مفاد میں بے دریغ استعمال کیا ہے۔ ملکی اقتصادیات اور عوام کی حالت سے چشم پوشی کرتے ہوئے سرمایہ پر قبضہ کیا ہے۔ سرمایہ داری نظام کو فروغ دیا ہے۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ ملک میں سیاسی انتشار پیدا کیا ہے۔ عوام میں سیاسی اور مذہبی منافرتیں پیدا کیں۔ صوبائی اور لسانی عصبیتوں کو جنم دیا ہے۔ عوام کو ہر طرح سے پسماندہ کرکے اپنے مخصوص طبقے کو عوام پر مسلط کیا ہے۔

ہم اقوام عالم میں سیاسی طور پر انتہائی گراوٹ کا شکار ہیں۔ ہمیں امریکہ کا حواری سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے گذشتہ پچاس برسوں میں اس امریکہ کی خدمت کی ہے۔ جسے پاکستان کے عوام اپنا دشمن تصور کرتی ہے۔ وہ امریکہ جو امن کے نام پر عالمی امن کو تباہ کررہا ہے، وہ امریکہ جس نے مظلوم کی حامی اور مزدور کی دوست قوتوں کو اپنی گھناؤنی سازشوں کے ذریعے پارہ پارہ کرکے سیاسی بالادستی قائم کرلی ہے۔ آج ہم اس امریکہ کی دوستی کے نعرے بلند کررہے ہیں۔ جس نے اپنے عوام کے عیش کیلئے تیسری دنیا کے ممالک کا سارا ذوق کھینچ لیا ہے۔ امریکہ کے ساتھ دوستی نے ہمیں اتنا کچھ ہی دیا ہے کہ اس نے ہمیں معاشی طور پر دیوالیہ کرکے سیاسی طور پر انتہائی کمزور بنادیا ہے۔ ہم نے اپنے ہمسایہ ممالک سے برادرانہ تعلقات قائم کرکے ایشیاء میں امن پیدا کرنے کی بجائے ایشیاء کی سرد اور گرم جنگوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم نے داخلی طور پر ملک میں ایک ایسے سیاسی نظام کو فروغ دیا ہے۔ جو مکمل طور پر غیر سنجیدگی پر مبنی ہے۔ جاگیروں اور صنعتوں پر قابض طبقے نے ایک ایسی گروہی سیاست کو جنم دیا ہے جو جھوٹ، فریب، مکاری، دھونس، دھاندلی اور ذات پات کے نظام پر قائم ہے۔ ایک حکمران طبقے نے

خود کو ایسی سیاسی جماعتوں میں تقسیم کررکھا ہے۔ کہ لوگ جس سیاسی جماعت کے ساتھ ہوں فتح اسی طبقے کی ہے۔

ہم نے گذشتہ پچاس برسوں میں ملک کو دولخت کیا۔ صوبائی، لسانی اور گروہی عصبتیوں کو ہوا دی۔ ملک میں ایک ایسی مذہبی منافرت پیدا کی کہ آج مسلمان مسلمان کا دشمن بن گیا ہے۔ مذہب کی خدمت کے نام پر انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف اس قدر نفرت پیدا کردی کہ ہر گروہ دوسرے کو مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ گروہی سیاست اور مذہبی منافرت نے شہروں کا امن تباہ کیا ہے۔ اور دیہات کی پاکیزہ زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ افسرشاہی نے ریاست کے اختیارات استعمال کرکے ایک ایسا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے جو رشوت، سفارش اور اقربا پروری پر مبنی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ ملک کا ہر ادارہ معاشی طور پر کمزور اور کارکردگی میں بے اثر ہے۔ سیاسی درازدستیوں نے ہر ادارے میں اپنا عمل دخل اس طرح جاری رکھا کہ فوج، عدلیہ اور پولیس جیسے ملک کے بڑے ادارے بھی محفوظ نہ رہے۔

گذشتہ پچاس برسوں میں عوام کیلئے آزادی کا ایک خواب بھی پورا نہیں ہوا۔ حتیٰ پچاس برسوں میں عوام کو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہ آسکا۔ عوام کو اپنے آزاد ملک میں سیاسی آزادی ملی نہ اظہار کی آزادی آج عوام کیلئے زندگی کی بنیادی ضرورتیں حاصل کرنا پہلے سے کہیں مشکل ہے۔ ملک میں بے روزگاری بڑھی اور محنت زیادہ سستی ہوئی۔ ایک مزدور کو صحت مند رہنے کیلئے پہلے اگر دس گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا تو آج اسے زندہ رہنے کیلئے سولہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ کسان جسکی محنت سے کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ آج اسے آٹے کے حصول کیلئے بازاروں میں مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔ خوراک ملاوٹ سے پاک نہیں اور ادویات جعلی ہیں۔ ڈاکٹر بے روزگار ہیں، اور مریض علاج کے بغیر مررہے ہیں۔ غریب کیلئے تعلیم بہت مہنگی ہے اور پھر حصول تعلیم کے بعد بھی بے روزگاری اس کا مقدر۔ ملک کی ۷۵ فیصد آبادی دیہات پر مشتمل ہے اور دیہاتی زندگی پہلے کی طرح جاگیردارانہ غلامی کا شکار ہے۔ ملک کی ۹۰ فیصد آبادی جہالت اور توہم پرستی کی اسلیئے شکار ہے کہ ۱۰ فیصد طبقے نے ملکی وسائل کو اپنے مفاد میں استعمال کیا ہے اور عوام کی حالت بہتر بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے اس مبارک موقع پر ہمیں اس بات کا عہد کرنا ہوگا کہ اگر ہمیں اپنے وطن سے پیار ہے اور ہم اسکے استحکام اور ترقی کے خواہاں ہیں تو پھر ہمیں اپنے اپنے شعبے میں لگن اور تندہی سے کام کرنا ہوگا۔ ہمیں اس ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کو بدلنے کیلئے ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا جس پر ہم سب عمل پیرا ہوکر ایک ایسا اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں جس کا خواب ہمارے اجداد نے دیکھا تھا۔

مؤتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ کی ایک اور پیش کش
وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ الآیۃ
انوارِ حق
جلد اول
جامعہ دار العلوم حقانیہ کے نائب مہتمم استاذ حدیث و تفسیر حضرت مولانا انوار الحق حقانی صاحب
کے خطبات اور مواعظ جمعہ کا حسین گلدستہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات
کی ایک جھلک "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ" کا ایک نمونہ علوم و معارف کا خزینہ مختلف موضوعات
پر علمی و دینی اور روح پرور تقاریر کا دلچسپ مرقع "از دل خیزد بر دل ریزد" کا
صحیح مصداق، سلاست اور جامعیت میں اپنی مثال آپ ہے، خطباء، واعظین مبلغین
اور اصلاحی حلقوں میں یکساں مفید ہے
خوشخبری:۔ کتاب شائع ہو گئی ہے! قیمت - ۸۰ روپیہ
مرتبین
حافظ فضل اللہ جان سواتی
حافظ سلمان الحق حقانی
مؤتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

ابو حماد محمد اسد اللہ ڈچکوٹی
(فیصل آباد)

"گولڈن جوبلی"

وطن عزیز کی عمر کے پچاس سال ہونے پر ملک میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ گولڈن جوبلی منائی جارہی ہے ۔ ارباب اقتدار کی سرپرستی میں فلمساز ، ڈرامہ نویس ، ڈرامے فلمیں اور دیگر رنگارنگ پروگرام ترتیب دے رہے ہیں ۔ ملک کے بین الاقوامی شہرت یافتہ گویوں کے پاس موجودہ وزیراعظم کی طرف سے نئے نئے گانے ، ترانے ، راگ گیت تیار کرانے کیلئے خاص مشیر صاحب پہنچے اور ان گویوں نے وزیراعظم کے پیغامات کو جنت کا ٹکٹ سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور گولڈن جوبلی کے موقع پر نئے گانے ، گیت ریکارڈ کرانے کی یقین دہانی کرائی ۔ علاوہ ازیں پاکستان میں دیگر ادارے گولڈن جوبلی کے موقعہ پر اور بھی بہت سی خرافات پیش کرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں ۔ توں محسوس ہوتا ہے کہ جوبلی کے موقع پر موسیقی ، ثقافتی پروگراموں ، نئی نئی فلموں ، نئے نئے ڈراموں ، گانوں ، گیتوں ، عریانی اور فحاشی کا ایک سیلاب آرہا ہے ۔ اور درحقیقت یہ ایک سیلاب ہی ہے اور سیلاب بھی ایسا جو اپنے ساتھ اسلامی اقدار ، اسلامی اخلاق ، اسلامی معاشرت ، چاردیواری کا تقدس ، قوم کی بیٹیوں کا دوپٹہ ، نسل نو کی آنکھوں کی حیاء وقت کا احساس ، اسلامی تشخص ، لوگوں کے دلوں میں بچا کھچا اسلام کا پاس ، شرافت ، اور نظریہ پاکستان کا تصور بہالے جائے گا ۔ اور اپنے ساتھ خدا اور رسول اللہ کی بغاوت ، ذہنی انار کی وآوارگی ، سامان عیش عشرت ، خوشنودی ابلیس الحاد ، لادینیت ، سیکولر ذہن ، یورپی تہذیب غرض ہر فتنہ وشر کا کوڑا کرکٹ ، غلاظت لے کر آئے گا ۔ کیونکہ ارباب اقتدار کا گولڈن جوبلی پر ایسے عفت و پاکدامنی ، شرافت سے عاری حیاء سوز اخلاق باختہ پروگراموں کی سرپرستی کرنے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ عوام کو نظریہ پاکستان کی حقیقت سے دور رکھا جائے اور ملک کو مغربیت کی طرف دھکیل دیا جائے ۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ گولڈن جوبلی کے موقع پر ابلیس مع اپنے سازوسامان کے "قال فبعزتک لاغوینھم اجمعین" کے عہد کو پورا کرنے کے لیے ملک کے بھانڈوں ، گویوں اور طبلہ نوازوں کے کندھوں پر سوار ہوکر آرہا ہے ، چنانچہ اس ناگفتہ بہ

حالت کو دیکھ کر عوام کا سنجیدہ طبقہ ایک طرف حکمرانوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ " جوبلی " کے نام پر ہونے والے اس تمام کھیل کود اور شور وہنگامے سے کیا پاکستان ترقی کرجائے گا ؟ پاکستان کے تمام پیچیدہ مسائل حل ہوجائیں گے ؟ عوام کی جان، آبرو، مال وعزت کو تحفظ مل جائے گا ؟ قتل وغارتگری کا گرم بازار سرد پڑ جائے گا ؟ عوام کے تمام دکھوں اور دردوں کا مداوا ہوجائے گا ؟ عوام کی اقتصادی، معاشی انفرادی، اجتماعی مسائل ہوجائیں گے ؟ اگر جواب اثبات میں ہوتو پھر جو چاہیں سو کریں اور اگر جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی ہی میں ہوگا تو پھران کھیل تماشوں، بے سود، لادینی اور غیر شرعی تقریبات اور پروگراموں پر لعنت بھیجئے اور " جوبلی " منانے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیئے جو ملک وملت اور قوم کیلئے مفید ترین ہو۔ اور دوسری طرف عوام کا یہی سنجیدہ طبقہ باثر علماء کرام سے بھی دریافت کرنا چاہتا ہے کہ اے وارثان منبر ومحراب وحاملان علوم نبوت وداعیان سنت رسول اللہ نوجوان نسل کے اذہان وقلوب کو بگاڑنے والے، فحاشی وعریانی کی حوصلہ افزائی کرنے والے فرنگیت کے جرائم پیدا کرنے والے، شریعت رسول اللہ سے باغی بنانے والے پروگرموں کے آگے آپ نے بندھ باندھنے کیلئے کوئی قدم اٹھایا ؟ قوم کے دینی ذہن کو تباہی سے بچانے کیلئے کوئی لحہ عمل تیار کیا ؟ بے دینی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ایمان کی کشتی کو ساحل عافیت پر لانے کیلئے کوئی کوشش کی ؟ ملک میں منظم طریقے سے پھیلائی جانے والی گمراہی کے سدباب کیلئے کوئی غورو فکر کیا ؟ وطن عزیز میں ایک منصوبے کے تحت ہندو ویہود کے طور طریقوں کو نوجوانوں پر مسلط کیا جارہا ہے کیا اسکی روک تھام کیلئے کوئی فکر ؟ اگر ذاتی وفروعی اختلافات سے فرصت نہ ملنے کیوجہ سے اب تک کچھ نہیں کیا تو پھر کیا اس وقت ہی کریں گے جب پورا ملک مغربیت کی آگ کی لپیٹ میں ہوگا، اسلامی معاشرت مٹ جائیگی، پورا ملک یورپ کا منظر پیش کرے گا، ہندو مسلم تہذیب کا امتیاز ختم ہوجائیگا، اسلام پر چلنے والوں پر پھبتیاں کسی جانے لگیں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا جینا دوبر ہوجائیگا، علم دین حاصل کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوگی، موسیقاروں، گویوں، فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہوگی، موسیقی جیسے شیطانی علوم وفنون کی تحصیل کی طرف نوجوان نسل کا رجحان بڑھ جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد انسانیت کی راہنمائی کرنے والو اے علماء کرام ! قوم آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر، آپکے پاؤں پکڑ کر، آپکے دامن کو تھام کر مودبانہ درخواست کرتی ہے کہ گولڈن جوبلی کے نام پر منعقد ہونے والی غیر شرعی تقریبات وپروگراموں کے غلط اثرات سے نوجوانوں کو بچانے کیلئے آپ بھی صوبائی اور ملکی سطح پر دینی تقریبات ومجالس کا اہتمام فرمائیں

جلسے، کانفرنس منعقد کریں، رسائل کے خصوصی نمبر شائع کریں، تقریری و تحریری طور پر الغرض ہر طریقے سے پاکستانی عوام کو نظریہ پاکستان (نفاذ نظام اسلام) سے آگاہ کیا جائے، قیام پاکستان کیلئے علماء کرام کے کردار سے روشناس کرایا جائے، ملک میں نظام اسلام کے نفاذ کیلئے عوام کو بیدار کیا جائے، نوجوانوں کو قرآن وسنت کی تعلیم کے حصول کیلئے تیار کیا جائے، رقص وسرور کی محافل کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے، اور قوم آپ سے یہ بھی درخواست کرتی ہے کہ اے علماء کرام خدارا ذاتی اختلافات کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیں، عہدوں اور منصبوں پر لعنت بھیجیں۔ فروعی اختلافات کو اختلاف رائے کی حدود ہی میں رکھتے ہوئے دشمنی، عدوات کی حدود میں داخل کرنے کی زحمت نہ فرمائیں، میدان میں آئیے قوم آپ کی منتظر ہے اور صحیح راہنماؤں کی تلاش میں ہے، قوم آپ کی راہ تک رہی ہے، قوم دیدے پھاڑ پھاڑ کر آپ کو تلاش کررہی ہے اور آپ ہیں کہ اختلافات کی وادیوں میں گم۔ خدانخواستہ اگر آپ فی الحال قوم کی صحیح راہنمائی کیلئے آمادہ نہیں ہیں تو پھر قرآن وحدیث میں آپ تھوڑی دیر کیلئے ذرا اپنا مقام ومرتبہ ہی دیکھ لیں اور بروز قیامت دربار خداوندی سے ملنے والے خصوصی انعامات پر ایک لمحہ کیلئے نظر فرمالیں اور رفاقت پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم سعادت پر نگاہ کرلیں اور ساتھ ساتھ اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ ان تمام مراتب عالیہ اور انعامات خداوندی کے ہم قوم کو حقیقی منزل کا راستہ دکھائے بغیر ہی حقدار بن جائیں گے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت کے حقوق کی ادائیگی کی صورت میں ------

دانت درست "تن" درست
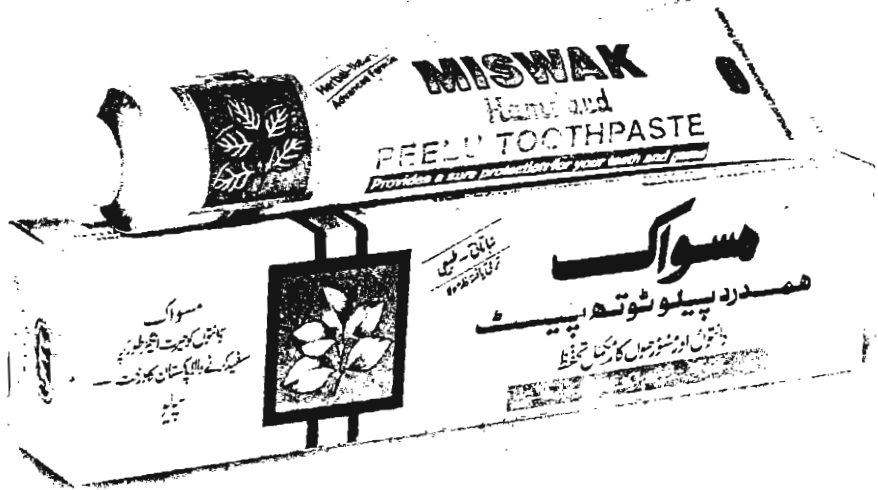
دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحت کے لیے انتہائی موثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دار و مدار صحت مند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذّتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دارچینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ "مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص صحتِ دنداں کی مضبوط اساس

ہمدرد

HMPT-22/95

جناب مولانا فداء محمد صاحب ایم اے
(یار حسین)

پچاس سال میں مختلف ادوار کا ایک سرسری جائزہ

۱۴ اگست ۱۹۹۷ء کو پاکستان کے پچاس سال پورے ہو رہے ہیں اور حکومت پاکستان نے ہر پہلو سے پاکستان "گولڈن جوبلی تقریبات" منانے کا عزم کر رکھا ہے۔ مگر ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ پچاس سال کے لمحات اہل وطن پر کیسے گزرے۔ اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو روحانی اور معنوی اعتبار سے اس پچاس سالہ سفر کا لمحہ لمحہ عذاب میں گزرا۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ بہت نامرادیوں کی باوجود مجموعی طور پر یہ سفر حوصلہ افزا رہا، اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ بیماریوں کے طوفان تھمے، تیل کے چراغ بجلی کے قمقموں میں تبدیل ہوگئے۔ رہٹ اور چرخیوں والے کنوئیں اب ٹیوب ویلوں میں تبدیل ہوگئے۔ مشینیں انسان کی دست و بازو بنتی چلی جارہی ہیں پس ماندہ پیشوں کو نیا وقار مل گیا۔ آبادی میں اضافہ ہورہا ہے۔ دیہات قصبوں اور قصبے شہروں اور شہر بڑے شہروں میں تبدیل ہوگئے۔ تحصیلوں، ضلعوں اور ڈویژنوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ ہر جگہ لوگوں کا ہجوم نظر آرہا ہے۔ زرعی اور صنعتی پیداوار میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ لوگوں کی آمدنیاں بڑھ گئیں ہیں۔ جس سے لوگوں کے معیار زندگی میں اضافہ ہوا ہے۔ آج کی یہ حالت اور منظر پچاس سالہ قبل کے یاس اور وحشت ناک حالت سے بہت مختلف ہے۔ یہ حالت ملکی باشندوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔ اور اہل وطن کے عزم اور عمل کے چراغوں کی روشنی میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر تصویر کا دوسرا رخ اگر دیکھا جائے تو مملکت پاکستان میں معاشی اور مادی ترقی کے ثمرات کی غیر منصفانہ تقسیم، بے انصافی، ظلم، بے ایمانی، بدعنوانی اور تشدد کے سلسلے پہلے کے مقابلے میں "ترقی" کے راستے پر گامزن ہیں۔

غالباً صفحہ ہستی پر ہم ہی واحد قوم اور ہمارا ملک واحد ملک ہے۔ جسکے ارکان شہریوں کی ایک بڑی تعداد اپنی قوم کو برا کہنے اور اس کے رہنما اپنے ملک کو توڑ دینے کے نعرے لگاتے ہیں۔ اور اپنی آزادی کو باعث عار سمجھتے ہیں۔ اور اس نظام کے مقابلے میں انگریزی نظام کو ترجیح دیتے ہیں ملک کی پچاس سالہ تاریخ میں سیاسی نظام کی ابتری اور خستہ حالی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے

حکمرانوں کی نظر عبرت وا نہ ہوئی ۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر پیپلز پارٹی اور دوسری لادینی قوتوں کی طرح حکمرانوں نے بھی محاذ آرائی شروع کردی ۔ اور حکمران ٹولے نے لیاقت علی خان کے دور کو پھر دہرایا ۔ حکومت سمیت ایم آر ڈی کی تمام سیاسی جماعتوں نے "شریعت بل" کی مخالفت کی

۱۹۸۸ء میں جب الیکشن ہوا ۔ تو ملک کی تاریخ میں پہلی بار اہل وطن کے سر اسلامی ریاستوں کے سامنے ندامت سے جھک گئے ۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار شرمندگی اور رسوائی کا سیاہ ترین باب قائم ہوا ۔ ہم پر عورت کی حکمرانی شروع ہوئی ، ایسی عورت سے ملک کی نظریاتی اساس کے تحفظ کا یقین رکھنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس دور میں ملک کے اندر فحاشی اور عریانی کی لہر دوڑنے لگی ۔ کرپشن اور بدعنوانی کا دور شروع ہوا ۔ تین سال کے اندر اندر اس نسوانی حکومت نے ملک کو تباہی کے راستے پر گامزن کردیا ۔ تین سال بعد اپنی آئینی مدت پوری ہونے سے پہلے غلام اسحاق خان نے اس حکومت کو فارغ کردیا ۔

۱۹۹۰ء میں آئی ۔ جے ۔ آئی کی حکومت قائم ہوئی ۔ مگر اس دور میں بھی اسلامی نظام کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہوئی ۔ نواز شریف نے آئی ۔ جے ۔ آئی میں شامل جماعتوں کو نظر انداز کردیا ۔ آئی ۔ جے ۔ آئی کے منشور پر عمل نہیں کیا ، جس کے نتیجے میں ان کی حلیف جماعتیں ان سے علیحٰدہ ہوگئیں اور خود حکمران جماعت بھی دو حصوں میں بٹ گئی ۔ مسلم لیگ میں ایک اور ٹولہ چٹھہ گروپ کی صورت میں نمودار ہوا ۔ اور نتیجتاً ان کی حکومت بھی ختم کردی گئی ۔

۱۹۹۳ء کے الیکشن میں ایک بار پھر ہم پر نسوانی حکومت مسلط ہوگئی ۔ اس حکومت نے پاکستانی مسلمانوں کی ساکھ کو کافی نقصان پہنچایا ۔ رشوت اور بدعنوانی میں پاکستان دنیا کا دوسرا کرپٹ ملک بن گیا ۔ میڈیا کے ذریعے پاکستانی نسل میں بے حیائی پھیلانے کے پروگرامز شروع کردیئے گئے ، ڈش انٹینا ملک میں عام ہونے لگا ۔ ملک میں افراتفری شروع ہوئی ۔ ملک کے باشندوں کی نظر میں قانون کی وقعت ختم ہوگئی ۔ 4 نومبر 1996ء اس نسوانی حکومت کا آخری دن تھا ۔

قیام پاکستان سے لیکر ابتک ہم نے کیا کچھ حاصل کیا ؟

اب ہمیں سوچنا چاہیئے کہ پچاس سالوں میں پاکستان نے کیا حاصل کیا اور کیا گنوایا ؟ ۔ سیاسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو کسی بھی سیاسی پارٹی نے آج تک اپنی آئینی مدت پوری نہیں کی ہے ۔ اس سے ہمارے سیاسی نظام کی خرابی واضح ہوتی ہے ۔ جب ان پچاس سالوں میں ہمارا سیاسی ڈھانچہ درست نہیں ہوا تو معاشی ڈھانچہ کسطرح درست ہوجائے گا ؟ کیونکہ ایک مستحکم سیاسی نظام ہی ایک

مستحکم معاشی نظام نافذ کر سکتا ہے۔ آج ہم 22 سو ارب روپے کے مقروض ہیں۔ اس ملک کے چار کروڑ انسان غربت کے انتہائی نچلے درجے سے بھی پست درجے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سات کروڑ آبادی کو پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں۔ ساڑھے سات کروڑ لوگوں کو علاج معالجے کی سہولتیں عدم دستیاب ہیں، ساڑھے نو کروڑ عوام کو حاجت رفع کرنے کیلئے پردہ دار جگہ اور گندے پانی کے نکاس کے وسائل حاصل نہیں۔ ہر سال آٹھ لاکھ بچے موت کے شکار ہوجاتے ہیں ان میں آدھے بچے پوری اور صحت مند غذا میسر نہ ہونے کی وجہ سے فوت ہوتے ہیں۔ شرح خواندگی کے لحاظ سے ہمارا ملک دنیا کے پسماندہ ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ پاکستان دس کروڑ بالغ باشندے ناخواندہ ہیں۔ دو کروڑ بچوں کو ابتدائی تعلیمی سہولتیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ اور جو بچے پڑھ رہے ہیں ان میں نصف پانچویں درجے سے آگے نہیں جاتے۔(خبریں ۱۵ جولائی ۱۹۹۷)

زراعت کے حوالے سے دیکھا جائے تو گندم میں ہم ابھی تک خود کفیل نہیں ہوئے۔ حالانکہ ہماری زرعی زمین کا نصف سے زیادہ حصہ پچاس ایکڑ یا اس سے زیادہ رقبے کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ امیروں اور جاگیرداروں کے قبضے میں ہے۔ دفاع میں ہم ابھی تک اپنے دشمن سے پیچھے ہیں۔ ابھی تک ہمارے پاس بحری بیڑا نہیں ہے۔ دوسری طرف ہمارے وزیراعظم صاحب نے میڈیا پر لوگوں کو بتایا کہ میں سرکاری خزانے کو ذاتی اخراجات کیلئے استعمال نہیں کروں گا، لیکن موجودہ بجٹ میں تو وزیراعظم کے گھر کے لئے ایک بلین روپے مختص کئے گئے ہیں اگر حساب لگایا جائے تو وزیراعظم کے اخراجات کا یومیہ خرچہ (پچھتر لاکھ روپے) آتا ہے۔ اسی طرح سربراہ مملکت کے دفتر اور ایوان صدر کیلئے 108 بلین روپے مختص ہیں۔ جن سے 35 لاکھ روپے یومیہ آتا ہے۔کیا ہمارا غریب ملک اتنی بھاری قیمت پر یہ خمیازہ اٹھا سکتا ہے؟

اگر ان 50 سالوں کی مجموعی حالت پر نظر ڈالی جائے، تو پاکستان نے پایا کم ہے اور کھویا زیادہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ملک کے سیاسی استحکام کا راز کیا ہے؟ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس نظریے کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا ہے اس نظریے کے بغیر اس ملک کی سیاسی استحکام ناممکن ہے۔ کیونکہ اس پچاس سالہ تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ 24 سالہ دور مارشل لاء نے بھی اس ملک کو معاشی اور اخلاقی طور پر مستحکم نہیں کیا اور 26 سالہ جمہوری حکومت نے بھی ملک میں عدل وانصاف کا نظام رائج نہیں کیا۔ اسلئے اب صرف ایک نظام باقی ہے اور وہ ہے اسلامی نظام۔ جبتک اسلامی شریعت کو نافذ نہ کیا جائے اس ملک کو سیاسی، معاشی اور اخلاقی استحکام نصیب نہیں ہوسکتا۔

جناب محمد عبدالرحمن بن مولانا موسیٰ خان البازی صاحب
جامعہ اشرفیہ (لاہور)

ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟

پچاس سال ہونے کو آئے ہیں لیکن پاکستان جہاں سے چلا تھا آج بھی اسی چوراہے پر کھڑا ہے، بلکہ شاید جس دور سے ہم چلے تھے وہ دور موجودہ دور سے کہیں بہتر تھا، کیونکہ اس وقت پوری دنیا میں ہمارا ایک مقام اور نام تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ ایک خطہ دنیا کے نقشے میں ایسا ابھرا ہے جو صرف اور صرف "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا نظام چاہتا ہے وہاں کی عورتیں اسی نظام کو لانے کے لئے بیوہ ہوئیں۔ بچے اسی کے لئے قربانی کی بھینٹ چڑھے، جوانوں نے اسی نام کی لاج رکھنے کیلئے جام شہادت نوش کیا۔ علمائے کرام نے اسی نام کی عظمت کی خاطر جیلوں میں جانا اور وہاں پر تشدد سہنا پسند کیا۔ لیکن ہائے ہماری قسمت! کہ حکمران ہی کچھ اس طرح کے ملے جن پر انگریز کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ انگریز تو چلا گیا لیکن اپنے چیلے یہاں چھوڑ گیا جو وقتاً فوقتاً اپنے آقاؤں کا یاد کرایا ہوا سبق دھراتے رہتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ کہ یہی چیلے اپنے آقاؤں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے اور وہ لوٹ مار مچائی کہ کائنات دم بخود رہ گئی، ملک اندھیر نگری بن گیا۔ اور پھر یہ وقت بھی آیا کہ کرپشن کے امتحان میں امتیازی نمبروں کے ساتھ تمام دنیا میں دوسرے نمبر پر آگیا۔ شاید یہی ایک اعزاز ہے جو انہی حکمرانوں نے بڑی "کوشش" کے بعد حاصل کرلیا ہے۔ اس اعزاز کو ہم سینے پر سجائے بجاطور پر فخر کر سکتے ہیں۔

ع　　　بدنام جو ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

جب عوام ہی نااہل، ہوس وزر پرست، اسلام دشمن عناصر کو منتخب کرینگے تو جو کچھ ہوا (اور ہو رہا ہے) بہت کم ہے یہ وہ لوگ ہیں جو سب کچھ لوٹ لینے کے بعد (کشمیر کے راجہ کیطرح) ملک کو بیچ دیتے ہیں۔ آج اگر ہم یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ ان پچاس سالوں میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ تو شاید پانے والے پلڑے میں کچھ بھی نہ ہو۔ (سوائے اس اعزاز کے)۔

گذشتہ دنوں گولڈن جوبلی کے موقع پر "ہم نے کتنی ترقی کی" کے موضوع پر ایک مقرر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نے کچھ ترقی کی ہوتی تو یہ تقریب منعقد کروانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ تقریب منعقد کروانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم لوگ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جبکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ترقی کی دوڑ میں ہم لوگ بالکل موجود ہی نہیں بہت پیچھے رہنا تو دور کی بات ہے پیچھے تو آدمی اس وقت رہے گا جب دوڑنے کی کوشش کرے گا۔ یہاں تو سرے سے کوشش ہی نہیں ہورہی۔

ے کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

اگر نظریں کچھ اونچی کرکے قومی اسمبلی میں جھانکا جائے تو افسوس اور شرم سے ہمارے سر جھک جاتے ہیں کہ جس جگہ کروڑوں روپے عوام کی خون پسینے کی کمائی ہوئی دولت کو ایک عمارت کی تعمیر پر اس لئے بہایا گیا کہ وہاں بیٹھ کر (ہمارے یہ نااہل) حکمران کچھ ملک کے بارے میں سوچیں، وہاں یہ لوگ ذاتی مفادات میں لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے گریبان پکڑ رہے ہیں یعنی ذاتیات کی بحث چھڑی ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئیے تھا کہ ایک غریب ملک کے مسائل (جو اب انہی کی وجہ سے مسائلستان بن چکا ہے) پر یہ لوگ بحث کرتے کہ اسکو کیسے سنوارا جائے۔ ہمارے ملک کے مسائل تو اتنے ہیں کہ ان حکمرانوں کو انکو حل کرنے کیلئے سر کھجانے کی فرصت ہی نہیں ملنی چاہئیے تھی۔ لڑائی جھگڑے کی نوبت تو اس وقت آتی ہے جب انسان فارغ بیٹھا ہو اور اسکے پاس اور کچھ کرنے کو نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ یہاں پر ملکی مسائل کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں گیا۔ انہی کے ہاتھوں آخر

ع　　اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اور جب ان سے کچھ کہا جائے تو کہتے ہیں ارے صاحب! پریشاں کیوں ہوتے ہو۔ ترقی یافتہ ممالک کی پارلیمنٹس میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اب انکو کون سمجھائے؟ کہ جناب وہ تو ترقی کی دوڑ میں اتنا آگے نکل چکے ہیں کہ اب اگر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو بھی ان پر کچھ آنچ نہیں آئے گی، جبکہ ہمارا معاملہ ان کے برعکس ہے۔

ے باہمہ ذوق آگہی، ھائے رے پستیٔ بشر

سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

ہندوستان میں جب ٹرین کے حادثات بہت بڑھ گئے تو وہاں کے وزیر ریلوے نے استعفیٰ

دے دیا۔ گذشتہ کچھ عرصے سے وطن عزیز میں بھی ٹرین کے حادثات بہت بڑھ گئے تھے، چنانچہ سابقہ حکومت کے وزیر ریلوے سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا گیا اور ان کو مثال بھارت کے وزیر ریلوے کی دی گئی تو موصوف نے بے دھڑک کہا تمھیں شرم نہیں آتی مجھے ہندو کی مثال دیتے ہو..... ۔

مقصد اس واقعہ کے لکھنے کا یہ ہے کہ گویا کھلے الفاظ میں ہم بھی ان "حکمران ٹولے" کو کہہ سکتے ہیں کہ تمھیں شرم نہیں آتی ہمیں کافروں کی مثالیں دیتے ہو۔ باہر سے آنے والے وفود ہماری پارلیمنٹ کی عمارت کی تعمیر اور وہاں کی آرائش وزیبائش دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور انکو ائیرکنڈیشن کے ٹھنڈے کمروں میں بٹھایا جاتاہے تاکہ ملک کی گرمی (اور حالات) ان پر اثرانداز نہ ہوں، لیکن ان غیر ملکی وفود کو کیا معلوم کہ یہ بلندو بالا عمارت تو اس لئے تعمیر کی گئی ہے تاکہ یہاں کے غریب، مظلوم اور مسائل میں گھرے ہوئے عوام کی فریاد اور موجودہ نظام سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کی چیخ وپکار کہیں اس عمارت کے اندر پہنچ کر ان حکمرانوں کے آرام میں خلل نہ ڈالے۔ گذشتہ عرصہ جب پارلیمنٹ ہاؤس میں آگ لگی جس سے کافی مالی نقصان ہوا۔ وہاں یہ بات بھی سننے میں آئی کہ اس عمارت کی لائٹیں کافی سالوں سے مسلسل جل رہی تھیں۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

جس ملک کے حکمران ملک میں ڈیموں کی کمی کا راگ الاپ رہے ہوں اور غریب پر لوڈشیڈنگ کا عذاب نازل کرکے مزید پریشان کیا جارہا ہو وہاں انکی اپنی یہ شاہ خرچیاں اور متضاد پالیسی ناصرف سمجھ سے بالاتر ہے بلکہ ظلم در ظلم ہے۔ ہر دفعہ کروڑوں، اربوں کا قرضہ ملک کو ترقی دینے کے بہانے لیا جاتا ہے لیکن ملک جوں کا توں ہے۔ نا اس پر ترقی کا میک اپ نظر آتا ہے اور ناہی مسائل کا حل۔ میرے خیال میں ہمارا یہ گلہ درست نہیں کیونکہ جس غریب ملک کی پارلیمنٹ کی لائیٹیں سالہاسال سال سے مسلسل جل رہی ہوں وہاں کے بل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ کیا عجب، وہ قرضے اسی بجلی کے بل کی نظر ہوجاتے ہوں تو پھر ملک بے چارہ کیا ترقی کرے؟

ہمارے موجودہ وزیر خارجہ کے بارے میں (جب یہ نئے نئے وزیر بنے تھے) غالباً "نوائے وقت" میں پڑھا تھا کہ یہ انڈیا کے بارے میں نڈر رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور پہلے بھی ایک دفعہ جب یہ ہندوستان گئے تھے تو وہاں پر ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے وہاں کے وزیروں پر تنقید کی تھی کہ ان کے پاس جو گاڑیاں ہیں اس سے کہیں بہتر ہمارے ملازمین کی گاڑیاں

ہیں۔ اگر واقعی ایسی بات ہوئی ہے تو وزیر خاجہ صاحب! حقیقت کو جھٹلانا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ حقیقت اپنے آپ کو خود ہی بیان کردیتی ہے۔ مؤدبانہ عرض ہے کہ "ترقی" اچھی گاڑیاں رکھنے کا نام نہیں۔ اگر ایک آدمی جائز طریقے اور قرضہ سے بچ کر روکھی سوکھی کھالیتا ہے تو یہ شخص بہتر ہے اس سے جو بھاری قرضے لے کر عیاشی کی زندگی گزارنے کی ناکام کوشش کررہاہے اور جب قرضہ دینے کی باری آتی ہے تو روتا، پیٹتا اور فریاد کرتا ہے۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ آپ لوگوں کا ان گاڑیوں کو درآمد کرنے کیوجہ سے ہمارا کتنا پیسہ باہر چلاجاتا ہے جس سے ملک کو کتنا نقصان اٹھانا پڑتا ہے؟

دل خون کے آنسو روتا ہے یہ سن کر کہ جس جگہ ملک کو بنانے کی باتیں ہونی چاہئیں تھیں وہاں ملک کو توڑنے کی باتیں ہوتی ہیں وہاں یہ کہا جاتا ہے کہ سندھ میں علیحدہ وطن کا نعرہ لگانے والوں سے کیسے اتحاد کیا جائے؟ وہاں یہ کہا جاتا ہے کہ سرحد کانام "پختونستان" ہونا چاہیئے۔ میں پوچھتا ہوں آخر سرحد کا نام تبدیل کردینے سے اس ملک کو اور عوام کو کیا حاصل ہوگا۔ انکے لئے سرحد رہے یا پختونستان۔ دونوں برابر ہیں۔ نام کے تبدیل کردینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آج نام تبدیل کردینے کی بات ہورہی ہے کل کو علیحدگی کی بات بھی ہوگی۔ خدارا حکمرانو! چنگاریوں کو ہوا مت دو۔ ورنہ پھر یہ آگ تمہارے گھروں تک بھی پہنچے گی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے حکمران حلف لیتے وقت ملک کو کمزور کرنے کی قسمیں کھاتے ہیں یا عوام کو دھوکہ دینے کی۔ بات بہرحال جو بھی ہو ہماری حکمرانوں سے صرف یہ التجا ہے کہ اگر وہ عوام کو دکھائے جانے والے سنہری سپنے پورا نہیں کرنا چاہتے تو بے شک نہ کریں۔ ملک کو ترقی دینا نہیں چاہتے تو بے شک نہ دیں۔ لیکن ملک کو کمزور کرنے کی باتیں تو نہ کریں، اس سے دشمن ممالک کے حوصلے بلند ہونگے اور ہم جو آزادی کی کچھ سانس لے رہے ہیں اس سے بھی محروم ہوجائیں گے۔

سپاس امتنان

ادارہ اس خاص نمبر کی تیاری میں جناب مولانا محمد ابراہیم فانی صاحب، مولانا یوسف شاہ صاحب، حافظ خواجہ صادق صاحب، مولانا عبدالوہاب مروت، ، نثار محمد، سجاد محمد، اور دیگر کارکنان ادارہ واہل خیر حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہے جنہوں نے اس شمارے کی تیاری میں ہمارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا۔ (ادارہ الحق)

پاک فین
پاکستان کا واحد پنکھا جو 500 ٹن کے
آٹومیٹک ہائی پریشر ڈائی کاسٹنگ پلانٹ
پر تیار کیا جاتا ہے
پاک فین کے علاوہ
آپ کسی بھی دوسری برانڈ کے پنکھے کی
باڈی کھول کر دیکھیں تو اس میں کچی دھات
کی طرح ہزاروں مسام نظر آئیں گے۔
جبکہ
پاک فین کی باڈی مساموں سے مکمل طور پر پاک ہے اور اس کی
موٹائی میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے کیونکہ پاک فین 500 ٹن کے
آٹو میٹک ہائی پریشر ڈائی کاسٹنگ پلاسٹنگ پلانٹ پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ پلانٹ ملک میں
ہمارے کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ مضبوطی میں اور چلتے وقت صحیح
بیلنس رکھنے میں عام ڈھلا ہوا پنکھا پاک فین کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور دوسرے برانڈ کے
پنکھوں کی باڈی کی موٹائی یکساں نہ ہونے کے باعث پنکھے
چلتے وقت ہلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ
جب پاک فین کے معیار کا پنکھا بنتا ہی نہیں
تو کوالٹی میں مقابلہ کیسا۔
PAK FAN
پاک فین کی پہچان
واحد انڈسٹریز
(پرائیویٹ) لمیٹڈ گجرات کا نام
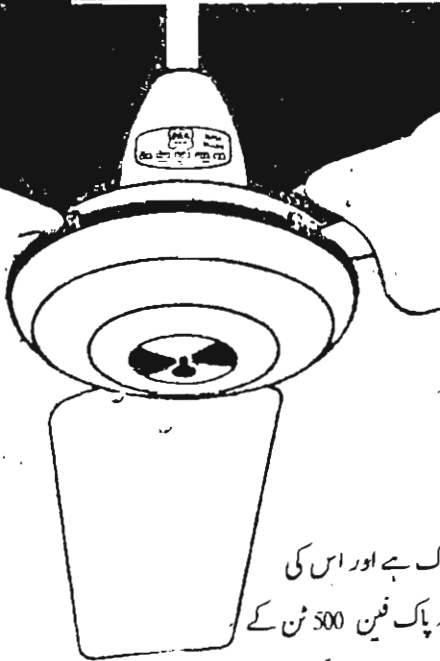
ہماری شہہ رگ" کشمیر" تا حال دشمن کے قبضہ میں ہے اور بقیہ وجود کرپشن، بدعنوانی ،لاقانونیت ،فرقہ واریت ،صوبائی ولسانی عصبیت ،ناانصافی ،غربت ،افلاس وغیرہ جیسے متعدد امراض اور بیماریوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور اس کے ناتواں کندھوں پر اربوں ڈالروں کا قرضہ لدا ہوا ہے ،اور اس کے دست و بازو یعنی پاکستانی قوم میں اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ قرضے کا صرف سود ہی ادا کرسکے ۔توکیا ایک ایسی قوم کے لئے جشنوں اور جوبلیوں پر اربوں روپیہ خرچ کرنا کیا بد ترین نادانی اور عیاشی نہیں۔ مقصد تخلیق پاکستان (خالص اسلامی حکومت کا قیام)سے مسلسل انحراف اور اعراض کی پچاس برسوں پر محیط یہ الم ناک کہانی بڑی طویل بھی ہے اور دردناک بھی ۔ قوم ایسے موقع پر جب کہ وہ حکمرانوں " الناس علی دین ملوکھم " کے مصداق ہوش وحواس کا دامن چھوڑ رہی ہے ۔ ایسے موقع پر ہماری یہ خدمت (خصوصی شمارہ) ملک وقوم کیلئے کس قدر سودمند ہے ۔ اس کا فیصلہ ہمارے قارئین اور دردمند حضرات کے ذمہ ہے ۔ اگر ہماری ان نواہائے پریشاں اورنالہ ہائے جگر سوزاں پراگر کوئی عبوسا قمطریرا ....اور چیں بجبیں ہو تو ہو

ہم پہ کوئی اعتراض نہ کرے کہ ہم کیوں آزادی کی جشن کے موقع پر قوم کو یہ دکھوں اور تلخ حقائق کا کڑوا گھونٹ پلانا چاہتے ہیں اور" رنگ میں بھنگ" کیوں ڈالنا چاہتے ہیں ۔ یا مبادا اس موقع پر ہم خوش نہیں تو یہ محض جاہلانہ سوچ اور خود فریبانہ و خود غرضانہ سوال ہوگا ۔الحمدللہ ہم دعویٰ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مادر وطن کی قومی خدمات اور جذبۂ حب الوطنی میں ہم کسی سے نہ پیچھے ہیں اور نہ کوئی ہم سے آگے ۔ "الحق" کا یہ خصوصی شمارہ قوم اور حکمرانوں کے لئے ایک آئینہ اور چشم کشا تصویر ہے یہ وطن ہمارا ہے اس کی عزت و آبرو کے لئے سوچنا اور کڑھنا ہمارا فرض ہے ۔ ہم حق کی سر بلندی اور سچائی کی خاطر یوں ہی پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے ۔ ہمیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا ۔کیونکہ

ع ہمارا خوں بھی شامل ہے تزئین گلستاں میں

آئیے ہم سب ملکر پاکستان کو حیات تازہ دیں ،اور اس کی تعمیر وترقی میں اپنی تمام توانیاں اور اپنا تن من دھن سب کچھ تج دیں اور حقیقی معنوں میں قرآن وسنت کی بالادستی اور خلافت راشدہ کے قیام کیلئے دن رات ایک کردیں ،قوم کی پریشاں تسبیح کے دانوں کو وحدت واخوت کی مضبوط لڑی میں پرودیں اور اپنے وطن کے خونچکاں دامن سے تمام عیوب کے داغ دھو ڈالیں۔ اور یہ عہد کریں کہ اس پاک وطن سے مغرب زدہ سامراجی ایجنٹوں (بے دین حکمرانوں ، ظالم سرمایہ داروں اور جاگیرداروں)کو ہمیشہ کیلئے نکال باہر کردیں گے ۔جس طرح ہمسایہ دوست افغانستان جہاں فرزندان توحید اپنے مقدس خون سے اسلامی تاریخ کا شاندار باب رقم کررہے ہیں۔ضرورت پڑی تو اپنے پیارے وطن کے لئے ہم بھی اپنے خون کا آخری قطرہ بہادیں گے ۔ہم اس دھرتی کو امن وآشتی اورحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس تعلیمات کی روشنی میں ایک مثالی اور مکمل اسلامی مملکت پاکستان بنا کر دم لیں گے ۔

(نوٹ) خاص نمبرمیں شامل تمام مضامیں کے ساتھ ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں (ادارہ)

REGD. NO. P 90. MONTHLY "AL HAQ" AKORA KHATTAK